رجسٹرڈ نمبر ل ۴۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ایک روپیہ

اُجرت اشتہار نگار

	۱۲ ماہ	۶ ماہ	تین ماہ	ایک بار
ایک صفحہ	۲۲۵ ر	۱۵۰ ر	۹۰ ر	۴۰ ر
نصف صفحہ	۱۱۳ ر	۸۸ ر	۵۰ ر	۲۰ ر
۱/۴ صفحہ	۵۵ ر	۴۵ ر	۲۵ ر	۱۰ ر

(۱) اگر اشتہار رسالہ کے اندر مضامین کے ساتھ دیا جائے گا تو اس اُجرت میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا اور اگر سرورق کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے صفحہ پر ہوگا تو ۳۰ فی صدی اضافہ ہوگا۔

(۲) اُجرت سوائے گورنمنٹ یا خاص خاص کمپنیوں کے ہر مشتہر سے یک مشت پیشگی لی جائے گی۔

حضرت نیاز فتحپوری کی بعض تصانیف

جو زیر ترتیب ہیں

(۱) **مکتوبات نیاز دوسرا حصّہ** — یہ حصہ بھی پہلے حصہ کے برابر ضخیم ہوگا اور اس میں اکثر حصہ ان مکاتیب پر مشتمل ہے جن میں انھوں نے اپنے خاص انداز میں مختلف شعراء کے کلام اور دیگر ادبی مسایل پر اظہار رائے کیا ہے۔ اسکی قیمت بھی ڈھائی روپیہ ہوگی۔

(۲) **انتقادیات** — یہ مجموعہ ہوگا اُن تمام مقالات کا جن میں ملک کے بعض مشہور شعراء کے کلام پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے اور ان شعراء کی فہرست میں جوشؔ ملیح آبادی، سیمابؔ اکبر آبادی، اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مراد آبادی، اثرؔ لکھنوی، دلؔ شاہجہانپوری مومنؔ، مصحفیؔ اور نظیرؔ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کی قیمت کا اندازہ تین روپیہ کیا گیا ہے۔

(۳) **مذہبیات** — اس مجموعہ میں حضرت نیازؔ کے وہ تمام مقالات ہوں گے جن میں مذہب و معتقدات مذاہب پر نقد کیا گیا ہے اور یہ وہ بیش بہا مقالات ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ایک انسان نہ صرف مذہب کی حقیقت بلکہ اس شاہراہ عمل کو بھی دریافت کر سکتا ہے جو انسانیت کی صحیح منزل تک پہونچانے والا ہے، اس کی قیمت کا اندازہ چار روپیہ کیا گیا ہے۔

(۴) **حکمیات** — اس مجموعہ میں حضرت نیازؔ کے وہ تمام مقالات شامل ہیں جن میں بعض اہم تاریخی اور علمی مسایل پر بحث کی گئی ہے۔ اس مجموعہ کی قیمت کا اندازہ بھی چار روپیہ کیا گیا ہے۔

(۵) حضرت نیازؔ کی فارسی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ، اس کی قیمت کا اندازہ دو روپیہ ہے۔

منیجر نگار

ریاضؔ مرحوم کی یاد میں

آج ریاضؔ کی شاعری ایک "جنس کاسد" کی حیثیت رکھتی ہے اور دُنیا اس پر سر دُھننا کیسا، "نگاہ غلط انداز" صرف کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں، لیکن ادبی و علمی دنیا میں ہر چیز کی قیمت کا اندازہ اُس زمانہ کے لحاظ سے کیا جاتا ہے جب وہ چیز پائی جاتی تھی ـــــ حالؔ کی چیز کا اندازہ حالؔ کے معیار سے اور "جنسِ ماضی" کی قیمت کا اندازہ ماضی کے معیار سے

پھر، مانا کہ ریاضؔ کی شاعری آج بوسیدہ ہے، نقش پارینہ ہے، اک متروک آرٹ ہے - لیکن اب سے نصف صدی پہلے وہ کیا تھا؟ ـــــ اس کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے، جب آپ اپنے کو اُسی زمانہ کا انسان فرض کریں، اُسی وقت کی فضا پیدا کرلیں اور اُسی عہد کے ذوق کو سامنے رکھیں

لکھنؤ ـــــ نغمہ و سرود والا لکھنؤ ـــــ مٹنے کے بعد بھی اپنی خاک سے عبیر و گلال اُڑانے والا لکھنؤ ـــــ تاراجِ خزاں ہونے کے باوجود بہار پر چشمک زنی کرنے والا لکھنؤ ـــــ یہ تھا وہ لکھنؤ جہاں ریاضؔ کی شاعری کی ابتدا ہوئی اور یہ تھی وہ فضا جس میں ریاضؔ کی گل و بلبل اور پازیب و ہیکل والی شاعری نے ترقی کی

پھر آج، جبکہ شاعری نام ہے صرف "سنجیدہ سوختگی" کا "متین برشتگی" کا اور کھل کھیلنے کی حالت میں بھی "جرأت رندانہ" کے فقدان کا - امیرؔ و داغؔ، جلالؔ و ریاضؔ کی گنجایش کہاں، لیکن ایک زمانہ تھا، جب لکھنؤ اب سے زیادہ زندہ تھا، زیادہ پُر رونق تھا، جب چوک کی معطر فضا میں "تماشائے لب بام" کی رسم جاری تھی اور شام اودھ کے دھندلکے میں نغمہ و سرود کی گونج باقی، یعنی وہ عہد جب "شمع سخن" کے پروانوں کی خاک سرد نہ ہوئی تھی اور لکھنؤ کی فضا پر یہی "غبار رنگیں" چھایا ہوا تھا ـــــ اسی عہد کی یاد تازہ کرنے کے لئے ریاضؔ نمبر شایع کیا جا رہا ہے

گہے طفلے شود مستانہ می رقصد!

پہلی جنوری سنہ ۴۳ء

نیاز

فہرست مضامین آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد-۴۳	جنوری و فروری سنہ ۱۹۴۳ء	شمار-۱-۲

اعترافات

یوں تو ہر وہ شخص جس کو شاعری سے کچھ بھی لگاؤ ہے، نہ حضرت ریاضؔ کے نام سے ناواقف ہوسکتا ہے اور نہ اُن کے رنگِ کلام سے بےخبر، لیکن خود ریاضؔ کیا چیز تھے اس کے جاننے والے وہی لوگ ہوسکتے ہیں جن کو اِس "رندِ باکباز" سے ملنے اور بار بار ملنے کا فخر حاصل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا شاعر، جیسا کہ اس سے قبل میں بارہا ظاہر کرچکا ہوں، بہ حیثیت انسان ہونے کے ایسی جنسِ فرومایہ ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو اُس کے پیش کرنے کی جرأت ہوسکتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر واقعی کوئی انسان اس گروہ میں نکل آیا تو پھر اس کا جواب اِس "عالمِ آب و گِل" کیا معنی "ملائکہ مقربین" اور "کروبیانِ تقدسین" کی جماعت میں بھی نہیں مل سکتا۔

اس حقیقت کی طرف اول اول میرا خیال اُسوقت منتقل ہوا جب غالباً سنہ ۲۵ء میں سب سے پہلے ریاضؔ کی زیارت کا شرف بھوپال میں مجھے حاصل ہوا اور پھر اس حقیقت کے مدارج رفتہ رفتہ مجھ پر اُسوقت واضح ہوئے جب میں لکھنؤ آگیا اور زیادہ قرب کے ساتھ، بار بار، رات دن کے مختلف حصوں اور متنوع کیفیات رکھنے والی صحبتوں میں ریاضؔ کے مطالعہ کی فرصت نصیب ہوئی۔

ریاضؔ کیا چیز تھے؟ اگر میں تفصیل سے کام لوں تو اس کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں، لیکن اختصار و اجمال کے ساتھ اگر کوئی دریافت کرے تو میں اس کے جواب میں وہی کہہ سکتا ہوں جو یوسفؑ کی خصوصیات معلوم کرنے کے بعد بعض زبانوں سے بے اختیار نکل گیا تھا کہ:-

"اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْم"

اور اس کے بعد بھی عرفی کا یہ مصرعہ پڑھوں گا کہ :-

مرغِ اوصافِ تو از اوجِ بیاں انداختہ

کیونکہ یوسفؑ تو خیر پیغمبر پیدا ہوئے، پیغمبر زندہ رہے اور پیغمبر مرے، اور اُن کے لئے "ملک کریم" ہو جانا کوئی امتیاز نہ تھا لیکن ریاضؔ تو بقول شخصے اس "تیرہ خاکدانِ ہند" میں ایک گنہگار انسانی خاندان میں پیدا ہوئے جوانی کا معصیت کوش زمانہ اُس فضا میں بسر کیا جہاں "حسن" کا مفہوم "استغنا" نہ تھا اور ضعیفی ان حالات کے تحت گزاری جب "ممنوعات و محرمات" کا سوال شرعاً و قانوناً دونوں طرح اُٹھ جاتا ہے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ریاضؔ اپنی زندگی کی کسی منزل میں، اپنی حیات کے کسی مشغلہ میں اور اپنی عمر کے کسی موسم میں ایک لمحہ کے لئے بھی اُس جادۂ انسانیت و اخلاق سے ہٹے ہوئے نظر آئے جو کبھی کبھی گنہگاروں کو تو مل جاتا ہے لیکن "زاہدانِ مرتاض" کے حصہ میں کبھی نہیں آتا۔ اس لئے اگر ان کو ملک کریم کہنے کے بعد بھی عرفی کی طرح اعترافِ قصور کیا جاوے تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔ ریاضؔ اُس عہد کی یادگار تھے جب اودھ اور مضافاتِ اودھ کے اکثر مقامات میں زندگی کا مفہوم باوجود انتزاعِ سلطنت کے بدستور خندہ و قہقہہ چلا آرہا تھا اور ہر صحبت اُس احساس حُسن و شباب کا مکمل نمونہ ہوتی تھی، جسے شعر و موسیقی کا خلاق کہنا چاہئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر اجتماع ہنگامۂ نائے و نوش تھا اور ہر منظر بساطِ گلفروش۔ بیفکریاں تھیں اور عیش کوشیاں، عیش کوشیاں تھیں اور ان اسباب کے ساتھ جن کا ایک ادنیٰ منظر صاحب رسائل طغرا کی زبان میں "بہم سی بناگوش مطربان جلاجل نعل در آتش" کے تیور لئے ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایسے مدہوش اور مدہوش کن زمانہ میں جوانی آئے اور شخص بھی کون ؟ ریاضؔ ایسا غیر معمولی طبع رنگین رکھنے والا، وہ جس قدر دادِ معصیت دیتا کم تھا، لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ یہ ساری عمر خمریات کی شاعری میں مبتلا رہکر ذوقِ بادہ سے ناآشنا رہنے والا اشاعر، یہ زندگی کی تمام شگفتہ سامانیوں کے ساتھ حُسن و شباب کے ہجوم میں بہترین ایام حیات گزارتے ہوئے جادۂ اخلاق سے کبھی ایک لمحہ کے لئے نہ ہٹنے والا شخص، جس طرح ایک انسان پیدا ہوا تھا۔ بدستور اسی طرح انسان رہا۔ اُس زمانہ میں بھی جبکہ گناہ سے پہلے "عذرِ گناہ" پیدا کر لیا جاتا ہے، ضعیفی کے وقت کا کیا ذکر کہ اس وقت تو ریاضؔ حقیقی معنی میں رضواں تھے۔

ریاضؔ کو میں نے اُس زمانہ میں دیکھا جب وہ ضعیف و کہولت کے دور سے گزر رہے تھے، لیکن باوجود اس کے کہ زمانہ موافق نہ تھا، حالات نے سخت دلگیر بنا رکھا تھا، ہجوم افکار نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، لیکن ریاضؔ باوجود سراپا غم و الم ہونے کے دوسروں کے لئے یکسر بہار و شگفتگی تھے۔ آپ خواہ کتنے ہی مغموم و ملول کیوں نہ ہوں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ ریاضؔ آپکو مل جائیں اور تھوڑی دیر کے لئے آپ کسی اور عالم میں نہ پہونچ جائیں، ان کی دلکش و دلنشین گفتگو اُن کا اندازِ بیان اُن کی لطیف بذلہ سنجیاں اور پھر سب سے بڑھکر اُن کا خلوص۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان کسی ایسی فضا میں پہونچ گیا ہے جہاں فردوس کی ہوا ہے۔ کوثر و سلسبیل کی روانی ہے اور طوبےٰ کے طیور کا ترنم ! بچوں کے لئے اُن کا وجود گہوارۂ استراحت، جوانوں کے لئے اُن کی ہستی داستانِ حسن و عشق اور ضعیفوں کے لئے اُن کی ذات ایک برادرانہ آغوش تھی۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص ریاضؔ سے ملے اور اپنے ذوق کو اُن کے پاس سے "ناآسودہ" واپس لائے۔

ریاضؔ نے اس زمانہ میں ہوش سنبھالا۔ جب لکھنوی شاعری شباب پر تھی اور داغؔ نے بھی دلی کے رنگِ سخن کو چمکا

رکھا تھا۔ ہر صحبت، صحبتِ شعر و سخن تھی اور ہر بزم دائرۂ شمع و لگن۔ رام پور میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے دربار میں ملک کے تمام اکابر شعراء کا ہجوم تھا، ہر محفل لطائفِ ادبیہ اور نکاتِ شعریہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور ریاضؔ بھی ان گلدستوں میں ایک گلِ نودمیدہ کی حیثیت سے کہیں نہ کہیں ضرور پائے جاتے تھے، اس لئے ریاضؔ کے شاعر ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اختلاف اس امر پر ہو سکتا ہے کہ ان کو کس رنگ کا شاعر قرار دیا جائے۔ اگر رنگ کی اس بڑی تفریق پر نظر ڈالی جائے جس کا تعلق دہلی و لکھنؤ سے ہے، تو یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ریاضؔ لکھنوی شاعر تھے اور اُن کے کلام میں قدرتاً وہی رنگ ہونا چاہئے جو اساتذۂ لکھنؤ کا تھا لیکن اگر اس کی تحتی تقسیمیں بھی ہو سکتی ہیں یعنی اگر لکھنؤ کی فضائے شاعری صرف ایک ہی لحن کی حکمران نہیں رہی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاضؔ کی نغمہ سنجیاں کن کیفیات سے متعلق سمجھی جائیں گی۔

ظاہر ہے کہ دہلی کی شاعری یکسر جذبات کی زبان و گفتگو ہے اور جذبات بھی وہی جن کا تعلق زیادہ تر یاس، حرماں، مجبوری و ناکامی سے ہے، اس لئے یوں تو جذبات کی وسعت کے لحاظ سے اس کو بھی بہت وسیع ہونا چاہئے، لیکن اس میں رنگا رنگی پیدا نہیں ہو سکتی اور اس کا تنوع ثابت کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی راگنی کو مختلف سازوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے، برخلاف لکھنؤ کے کہ وہاں کی شاعری کا تعلق جذبات سے کم اور معاملات سے زیادہ ہے اور معاملات کی دُنیا چونکہ بے پایاں چیز ہے اس لئے لکھنؤ میں مختلف رنگ کے شعراء نظر آتے ہیں اور شوخی و بے باکی، محاکات و معاملہ بندی رندی و آزادی، جوش و سرمستی وغیرہ بہت سی وہ باتیں جن کا تعلق عشق کی مادی دنیا سے ہے، یہاں کثرت سے نظر آتی ہیں، جنھوں نے مختلف اسلوب بیان کے تحت نہ صرف تشبیہات و استعارات کی فضا کو بہت زیادہ وسیع کر دیا، بلکہ زبان کو بہ حیثیت زبان ہونے کے بھی بہت ترقی دی جس کو "رعایت لفظی" کے روشن پہلو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ دہلی کی شاعری میں یہ فرق کیوں پیدا ہوا؟ اس کا کھُلا ہوا سبب غالباً یہ تھا کہ دہلی کی شاعری کا کمال سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ہوا اور لکھنؤ کی شاعری نے آنکھ کھولی تو اودھ کی حکومت شباب پر تھی، پھر چونکہ انسان کا خیال جذبات کا آئینہ ہے اور جذبات پیدا ہوتے ہیں ماحول سے اس لئے دہلی کی شاعری میں سوز و گداز، حسرت و یاس کا پیدا ہونا ضروری تھا اور لکھنؤ کی شاعری میں بیان نشاط، وقت کا اقتضاء تھا۔

دہلی کا شاعر ایک ایسا عاشق تھا جس نے سوائے مجبوری کے کچھ نہ دیکھا تھا، جس کو لذّت کامیابی بہت کم حاصل ہوئی تھی، جو غریب تھا، بیکس تھا، مجبور و ناچار تھا، اس لئے وہ سوائے اس کے کہ رات دن روتا، ہائے ہائے کرتا، اور کر ہی کیا سکتا تھا برخلاف لکھنؤ کے شاعر کے کہ وہ ایک عاشق تھا وصل نصیب، ناآشنائے مجبوری اس لئے وہ شراب پیتا تھا، جوانی کے لطف اُٹھاتا تھا اور چھیڑ چھاڑ اس کا رات دن کا مشغلہ تھا۔

پھر چونکہ غم کی صرف ایک زبان ہے، اس لئے دہلی کی شاعری نے عمیق جذبات اور روحانیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی ترقی کی ہو لیکن راگنی وہی ایک تھی اور لکھنؤ کی شاعری نے انسانی زندگی کی کیسی ہی عام سطح کیوں نہ نمایاں کی ہو، لیکن چونکہ نشاط کی زبانیں کثیر ہیں اس لئے اس میں تنوع، رنگینی، لطف زبان، حسن بیان کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ہر شخص فطرت کی طرف سے ایک خاص ذوق لیکر آتا ہے۔ اور اسی ذوق کے تحت وہ ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ سوائے اس مخصوص میلان کے وہ اپنے دیگر داعیات نفس سے کام نہیں لے سکتا، بعض اوقات ایسی ہمہ گیر ہستیاں بھی رونما

ہو جاتی ہیں جن کے لئے ہر چیز مخصوص ہوتی ہے اور ہر وہ چیز پر حکمراں نظر آتی ہیں لیکن بہت کم۔ اور یہی سبب ہے کہ لکھنؤ کے شعرا میں ایسے بہت کم نفوس آپ کو ملیں گے جنھوں نے محفل نشاط کے بھی تمام مناظر کو اپنی حدود شاعری کے اندر لے لیا ہو، چہ جائیکہ بزم عزا اور اسی لئے جب ہم ایک لکھنوی شعرار کو دیکھتے ہیں تو خصوصیت کے ساتھ ہم کو یہ محسوس کرنا پڑتا ہے کہ اس کا فطری ذوق یہ ہے اور فلاں فلاں جذبات اس کے ذوق سے خارج ہیں۔ جن کو اس نے اکتساباً اپنے ذہن کی مدد سے حاصل کرنے میں ایک ناقص کامیابی حاصل کی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب ہم کسی شاعر کے متعلق کچھ کہیں تو پہلے یہ فیصلہ کریں، کہ اس کا صحیح رنگ کیا ہے اور فطرت سے وہ کن جذبات کی پرورش کے لئے آیا ہے۔

انتقاد کی ایک عام غلطی جس میں تقریباً ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے، یہ ہے کہ نقاد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لکھنے والے نے اُس کے ذوق کی رعایت کس حد تک کی ہے اور اُس کے نقطۂ خیال سے کون کون سا حصہ ایک تصنیف کا مکمل کہا جا سکتا ہے اور اسکے بعد وہ ایک قطعی حکم لگا دیتا ہے کہ فلاں جزو ایک کتاب کا اچھا اور فلاں خراب ہے۔ میرے نزدیک یہ اصولی غلطی ہے۔ اگر ایک شخص کا دماغ زندگی کے مختلف شعبوں، کارگاہ حیات کے کثیر الانواع مناظر، جذبات انسانی کے مختلف کوائف، تمثیل فن کی متعدد اشکال اور فطرت کے بوقلموں مظاہر سے علٰحدہ علٰحدہ لطف اندوز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا تو اس کو انتقادی ذمہ داریاں اپنے سر نہ لینا چاہئے، کیونکہ اس کے لئے ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو ہمہ گیر ہو اور ہر چیز کی جداگانہ حیثیت و امتیاز کو سمجھ کر اس کے نقائص و محاسن کا درک کر سکے لیکن چونکہ یہ صفت شاذ و نادر کسی میں پائی جاتی ہے، اس لئے حقیقی معنی میں نقاد کا وجود بھی بہت کم نظر آتا ہے اور عام طور پر انتقادی مقالے تنقیصی جرح سے زیادہ کوئی اور حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔

فرض کیجئے کہ ایک نقاد فطرت کی طرف سے یہ ذوق لیکر آیا ہے کہ جذبات سوز و گداز کو پسند کرتا ہے اور یہ پسندیدگی اس قدر غلو کی حد تک پہونچ گئی ہے کہ کوئی اور جذبہ اس کو پسند نہیں آتا تو اس کو یقیناً نقد کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ نقد وہی شخص کر سکتا ہے جو اگر ایک طرف میر کے اس شعر پر سر دھن سکتا ہے:۔

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جاں سمیت

تو دوسری طرف داغ کا یہ شعر بھی اسے بیچین بنا دیتا ہو:۔

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے ہوا چھپاتے ہیں جو وہ سینہ کمر نہیں چھپتی،

الغرض نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی طبیعت اپنی اپنی جگہ ہر رنگ کا لطف اُٹھا سکتی ہو اور وہ ہر کتاب کا مطالعہ صرف اس کے موضوع اور مصنف کے میلان طبع کے لحاظ سے کر سکتا ہو۔ شاعری حقیقتاً ایک نوع کی مصوری ہے، پھر جس طرح مصوروں میں بعض صرف مناظر کی تصویر اچھی کھینچ سکتے ہیں۔ بعض صرف جاندار اشیاء کو صفحۂ کاغذ پر زیادہ خوبی کے ساتھ نمایاں کر سکتے ہیں، بعض کا قلم صرف جذبات ہی کے اظہار میں اچھا کام کرتا ہے۔ اسی طرح شعرا کا حال ہے کہ بعض صرف تشبیہات و استعارات کے دلدادہ ہیں بعض فقط رعایت لفظی کے پابند ہیں، بعض کو معاملات حسن و عشق کی رنگینی پسند ہے اور بعض کو سوز و گداز پھر جس طرح ہم ہر مصور کی تصویر کا صرف اس کی فطری ذوق کی بنا پر مطالعہ کر کے اُس کے نقائص و محاسن کو دیکھتے ہیں، اسی طرح ایک شاعر کے کلام پر اُس کے مخصوص ذوق کے لحاظ سے نقد کرنا چاہئے، ورنہ وہ صرف اپنے معیار کی رعایت ہوگی جو یقیناً فن نقد کے لحاظ سے سخت ناروا جسارت ہے۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہ اس وقت تک ریاض کے کلام پر جو لکھا گیا ہے یا آئندہ لکھا جائے

اس کو اسی اُصول سے دیکھنا چاہیئے جو میں نے ابھی عرض کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ریاضؔ کا حقیقی رنگ کیا ہے، اس میں کلام نہیں کہ ریاضؔ کی شاعری یکسر رندانہ ہے اور اس مخصوص رنگ کے لئے جس قدر شوخی کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے پھر چونکہ رندانہ کلام کا لطف خمریات ہی میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے اس لئے ریاضؔ اپنے خمریات کے لحاظ سے زیادہ مشہور ہوئے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شوخی کا جس حد تک تعلق ہے وہ خمریات و غیر خمریات ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں اور حُسن و عشق کی کامیاب زندگی اور مادیات محبت کی نشاط آفرینیوں میں مشکل سے کوئی دوسرا اُن کا ہمسر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ریاضؔ کے کلام میں کہیں کہیں ایسے شعر بھی نظر آتے ہیں:

ہمیں خُدا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا — نکل گئے ہیں بہت دور جستجو سے ہم

کبھی حرفِ محبت تا بہ لب آیا تھا چپکے سے — اُسی نے رفتہ رفتہ طول کھینچا داستاں ہو کر

نہ رو کے طور تو ہم جائیں عرش سے اونچے — ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا

ہوا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا — وہی بزم آرائے محشر نہ نکلے

ہم اُڑ کر بھی نہ پہونچیں ہم سے اتنی دور ہو جانا — مُبارک شاخِ گُل کو شاخِ نخلِ طور ہو جانا

کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا — ہم آئے تو پردے سے باہر نہ نکلے

لیکن یہ اُن کا مخصوص رنگ نہیں ہے ——— اُن کا صحیح رنگ جس میں وہ اپنی جگہ بالکل تنہا نظر آتے ہیں، شوخی بیان ہے جس کو علاوہ خمریات کے میں نے تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) وہ جس میں زیادہ تر اسلوب بیان سے شوخی پیدا کی گئی ہے اور ایک حد تک جذبات بھی وابستہ ہیں، لیکن وہی جذبات جو عریاں معاملات حُسن و عشق سے متعلق نہیں ہیں۔ مثلاً

دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا — کلیم طور پر اُن سے جو گفتگو آئے

اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے — تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو — یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری

تمہارے کوچہ میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں — ذرا تم آ کے لبِ بام مُسکرا دینا

روشن کئے چراغ لحد لالہ زار نے — اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے

جو ساتھ دے تو یہ دنیا سوا ہے جنّت سے — مزے کی چیز الٰہی شباب ہوتا ہے

خراب ہی سہی رہ جائیں دن جوانی کے — سنا تو ہے یہ زمانہ خراب ہوتا ہے

اُٹھا ہوں خوف زدہ میں لحد سے قبل از وقت — کہ سب سے پہلے مری حشر میں پکار نہ ہو

نزع میں یار سے پیمانِ وفا کرتے ہیں — اس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

یہ وہ رنگ ہے جس پر کسی کو اعتراض ہو ہی نہیں سکتا اور جو لکھنؤ دہلی دونوں جگہ کے شعراء کے درمیان مشترک ہے۔

(۲) وہ جس میں شوخی کے خط و خال زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، اور کہیں کہیں محاکات بھی ہے۔ مثلاً:-

آتے آتے ترے لب تک وہ تبسم بن جائے — اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

چپ سے میں کچھ مری آغوش میں وہ حشر کے دن | یہ وہی ہیں جنھیں پیمانِ وفا یاد نہیں،
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی | تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی
چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض | اک حسیں اسوقت ہو ان کے منانے کے لئے
اُن کے آنچل میں ادا بنکر قیامت چھپ چکی | وہ مری جانی ہوئی وہ میری پہچانی ہوئی

ریاض کا یہ رنگ بھی کسی کے نزدیک قابل اعتراض و گرفت نہیں ہو سکتا بعض بعض شعر تو اس قیامت کے نظر آتے ہیں کہ اگر وہ رنگ اختیار نہ کرتے تو اُردو شاعری پر ظلم کرنے والے کہلاتے۔

شباب کو شراب کہنا، اور صاحب شباب کو مینائے شراب سے تعبیر کرنا کوئی نئی بات نہیں لیکن ریاض نے جس انداز سے شباب کی تصویر کھینچی ہے کہ

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی

اسلوب ادا اور محاکات کی ایسی دلکش مثال ہے کہ ریاض کی قادر الکلامی پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

(۳) وہ جس میں شوخی بالکل برافگندہ نقاب یکسر عریاں اور سراپا بے باکی بنکر رونما ہوتی ہے مثلاً:-

کوئی منھ چوم لے گا اس نہیں پر | شکن رہ جائے گی یونہیں جبیں پر
یہ آدھی رات کو اُن کا پیام آیا ہے | ہم آج آ نہیں سکتے اب انتظار نہ ہو
آڑی ہیکل کو چوم لے گی، | وہ چیز جو کچھ اُٹھی اُٹھی ہے

یا پھر ان سب سے زیادہ قیامت یہ شعر

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے | جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھالے

یہ وہ قسم ہے جس پر ہر سنجیدگی پسند شخص کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن صرف اس قدر کہ ناواجب شوخی ہے، متبذل کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ اگر اپنے اوپر پہلے وہ حال طاری کر لیا جائے جس کے ماتحت ریاض نے یہ شعر کہے ہیں تو یہ اشعار نہ صرف بہت زیادہ پر لطف معلوم ہوں گے بلکہ اُن کی اس مقناطیسیت کی بھی داد دینا پڑے گی جو تھوڑی دیر کے لئے ضعیف سے ضعیف انسان کو بھی ایک بار جوان بنا دیتی ہے اور تمام جدید ترین کیمیائی ذرائع سے بھی زیادہ قوی و زود اثر ہے۔

جس طرح ریاض کے عام کلام کی شوخی تین درجوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے اسی طرح اُن کے خمریات کی بھی تین تقسیمیں ہو سکتی ہیں:- ایک وہ جس میں انھوں نے بادہ کشی کے مضمون کو نہایت جوش و سرمستی کے ساتھ لیکن بلند خیالات کے ماتحت پیش کیا ہو مثلاً

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے | خداوندا، مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے
بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں | جہاں ساغر پٹکدیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
شررِ طور ہے جو موج ہے پیمانے میں | بجلیاں کوندتی ہیں آج تو میخانے میں
ایک ہی چلو کے ہیں کوثر و تسنیم ریاض | خاک اُڑتی جو لبِ خشک مرا تر ہوتا
ارے واعظ کہاں کا لامکاں، عرش بریں کیسا | چڑھی ہوتی جو کچھ تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے

یہ رنگ ریاض کی خمریات کا تو بے مثل ہے اور اس کی داد دینے میں شاید شیخ و زاہد کو بھی تامل نہیں ہو سکتا لیکن خمریات

کی وہ دوسری تقسیم بھی جس کا تعلق حقیقتاً صحنِ میخانہ ہی سے ہے — کم پرلطف نہیں۔ مثلاً :

فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں — ہمیں بھی آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے

مر گئے پھر بھی تعلق ہے جو میخانے سے — میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی، — جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی — ہم رندسن کے قلقلِ مینا کہیں جسے

نااہل ضرور ہیں وہ میکش — جن پر یہ حرام ہو گئی ہے

بعد اک عمر کے میخانہ میں آئے ہیں ریاض — آپ بیٹھے ہیں بچائے ہوئے دامن کیسا

ڈھلتی ہے ساتھ خضر کے سبزہ کے فرش پر — جمتے ہیں وہ بھی آکے لب جو کبھی کبھی

شراب پیتے ہی مسجد میں ہم کو گرنا تھا — یہ شغل بیٹھ کے اچھا تھا قبلہ رو کرتے

جام مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن — سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

تیسری قسم کی مثالیں جس میں وہ بہت زیادہ کھل کھیلے ہیں بہت کم نظر آتی ہیں مثلاً :-

نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی، — قرض پی آئے اک دکاں سے آج

خمِ مسجد میں مئے ناب بھریں جاڑوں میں — ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے ٹھٹھرنے والے

کلام ریاض کی ایک اور خصوصیت جس میں سوائے امیر اور جلال کے ان کے دور کا کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں، اسکا بےعیب ہونا ہے۔ آپ ریاض کا پورا کلیات چھان ڈالئے، لیکن آپ کو زبان یا فن کی غلطی مشکل ہی سے کوئی ملیگی اسلئے کلام ریاض علاوہ دوسری خوبیوں کے ایک معلمانہ حیثیت بھی رکھتا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے کہ ناسخ ایسا غیر شاعر، شاعر بھی اسی کے بدولت آج اساتذۂ فن میں شمار کیا جاتا ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ ریاض زیادہ تر اپنے خمریاتی رنگ کی وجہ سے مشہور ہوئے اور لوگوں نے انھیں اسی رنگ کا شاعر سمجھا، حالانکہ کیفیت کے لحاظ سے "خراباتی شاعر" کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں انھوں نے "بادہ و ساغر" کی گفتگو بہت کی ہے، لیکن بالکل اسی طرح جیسے "ناز و غمزہ" کو "دشنہ و خنجر" سے تعبیر کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت شوخ طبع پیدا ہوئے تھے اور چونکہ "مے و مینا" کے ذکر کے سلسلہ میں ان کو اظہار شوخی کا زیادہ موقع حاصل تھا اس لئے ان کے یہاں اس رنگ کے شعر زیادہ تر ذکرِ "شراب" ہی کے سلسلہ میں پائے جاتے ہیں۔ ورنہ "خمریاتی شاعر" کے اس پہلو سے جسے صحیح معنی میں رندانہ مستی و ربودگی کہتے ہیں انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

آپ ان کے خمریاتی رنگ کا کوئی شعر لیجئے، وہ عام شوخی کے تحت میں آئے گا اور اس میں کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو واقعی کسی "مے خوار" کی کہی ہوئی معلوم ہو۔ ریاض دراصل صرف شوخ نگار شاعر تھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنی شوخ نگاری کے لحاظ سے اسیر کے تلامذہ میں سوائے ایک دو کے وہ سب سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں — ریاض نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے کہ

خوش ہو گئے ریاض سے بھی ملنا — کیا باغ و بہار آدمی ہے

اور اس سے بہتر رائے زنی خود ان کے اور ان کے کلام کے متعلق کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ جیسے وہ خود "باغ و بہار" تھے ویسی ہی ان کی شاعری بھی یکسر "باغ و بہار" تھی۔

نیاز

مختصر سوانح حیات

حضرت ریاض کی ولادت سنہ ۱۲۷۰ھ (سنہ ۱۸۵۳ء) خیر آباد میں ہوئی جو ضلع سیتا پور (اودھ) کا مشہور قصبہ ہے۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید طفیل احمد بڑے پایہ کے عالم تھے، آپ کا نسب حضرت مخدوم شیخ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت قاضی سید بخش رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے حضرت سید شاہ شجاع کرمانی تک پہونچتا ہے۔

آپ کے آبائے کرام میں اکثر حضرات سلاطینِ روزگار کی جانب سے معزز عہدوں پر مامور ہوتے رہے، چنانچہ خیر آباد کا عہدۂ قضا آپ ہی کے خاندان سے مخصوص تھا جس کے صلہ میں شاہانِ وقت کی طرف سے جاگیریں بھی عطا ہوئی تھیں جو کم و بیش غدر کے زمانہ تک باقی رہیں۔ خیر آباد کا محلہ قضیارہ اسی عہد کی یادگار ہے۔

حضرت قاضی سید بخش صاحب کا مزار مکانِ ریاض سے متصل ہے اور انھیں کے زیر سایہ بزرگان ریاض محو خواب ہیں۔

حضرت ریاض نے ابتدا میں فارسی اپنے والد ماجد سے پڑھی اس کے بعد مولوی حافظ سید نبی بخش صاحب مرحوم کے مدرسۂ عربیہ میں داخل ہوئے، ابھی وسطی درجوں تک پہونچے تھے کہ شاعری کا شوق دامنگیر ہوا۔ اس زمانہ میں اسیر مرحوم کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا، آپ بھی اسیر کے شاگرد ہوئے لیکن شروع میں اپنی مشکل پسند طبیعت کے اقتضا سے غالب کے رنگ میں مشق سخن کرتے تھے۔ اسیر مرحوم ریاض سے بہت محبت کرتے تھے مگر ان کی صحبت سے ریاض اس لئے پژمردہ واپس آتے کہ جناب اسیر لوگوں کو ریاض کے اشعار ''بوجھیئے'' کہکر سناتے اور یہ بات ریاض کو بہت کھٹکتی۔ یہ زمانہ اسیر مرحوم کی ضعیفی کا تھا اور امیر مینائی اسیر کے گویا جانشین بن چکے تھے اس لئے اسیر نے ریاض کو بھی امیر کے سپرد کر دیا اور حضرت ریاض نے اپنا کلام بغرض اصلاح منشی امیر احمد صاحب کو رامپور بھیجنا شروع کیا امیر مینائی سے ریاض کو حد درجہ عقیدت تھی چنانچہ حضرت ریاض کا خود بیان کیا ہوا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:۔ ''مہاراجہ محمود آباد نے ایک مرتبہ بر سبیل تذکرہ مجھ سے فرمایا کہ ''ریاض اس وقت امیر اگر زندہ ہوتے تو وہ تم پر فخر کرتے''۔ میں نے عرض کیا: ایسا نہ فرمایئے وہ اُستاد تھے —— مہاراجہ یہ جواب سنکر بھی جب اپنی رائے پر قایم رہے تو میں نے اپنا ایک شعر سُنایا:

نسیم آئی ہے شمع مزار گل کرنے ۔۔۔ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی بجھ گئی ہوگی

اس شعر میں اُستاد نے کوئی لفظ نہ گھٹایا نہ بدلا بلکہ ایک لفظ بڑھا دیا:

نسیم (اب) آئی ہے شمعِ مزار گل کرنے ۔۔۔ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی بجھ گئی ہو گی

یہ اصلاح سنکر مہاراجہ بہت متاثر ہوئے اور فرمانے لگے واقعی جاد اُستاد خالی ست''

سنہ ۱۸۷۲ء میں ''لمع رخشاں'' کے تاریخی نام سے خیر آباد ہی میں ایک مطبع قایم کرکے ''ریاض الاخبار'' جاری کیا جسکی نثر میں بھی شاعری کا لطف تھا۔ ادبی حیثیت کے علاوہ ریاض الاخبار کی رائے قومی اور ملکی معاملات میں بھی بہت مستند اور باثر سمجھی جاتی تھی۔

ریاض الاخبار ہی کے سلسلے میں خیر آباد سے "روزانہ تار برقی" بھی نکالا - یہ پرچہ کتابی تقطیع کے دو ورق پر چھپتا تھا - غازی عثمان پاشا معروف بہ رستم پلونا کی جنگ روس و روم جس تفصیل اور شان سے اس میں چھپی وہ دیکھنے کے قابل تھی مگر اس وقت کے پرچے اب کہاں - سنہ ۷۹ء میں خیر آباد ہی سے ایک شعر وسخن کا ماہنامہ "گلدستۂ ریاض" جاری کیا جس کا مقصود شعراء کے بہترین اشعار کی اشاعت تھی اور اُردو زبان کا یہ پہلا موقر اور مستند پرچہ تھا جس میں مشاہیر شعراء اور والیانِ ریاست کی غزلیں طرح پر شایع ہوتی تھیں - سنہ ۸۱ء میں سیتاپور کے ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ایما سے آپ اپنا اخبار گورکھپور لے آئے وہ گورکھپور جہاں اپنے والد کے ساتھ جو وہاں کورٹ انسپکٹر تھے وہ اپنا عہدِ طفلی اس طرح گزار چکے تھے کہ :

"ریاض کے ساتھ گورکھپور کے امراء ہندو مسلمانوں کی جو نئی پود بڑھ رہی تھی گویا ایک بھر پور بے شمار خوشبودار پھولوں کا باغ تھا جس میں ریاض بلبلِ شیراز بنا ہوا تھا گورکھپور کی جوان ہونے والی جماعت سے لیکر بڑھاپے تک نہ پہونچنے والی تک کی ہر جماعت صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک بے ریاض کے زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی - "مشرق" ۴ر اگست سنہ ۴۳ء"

اس انگریز سپرنٹنڈنٹ پولس نے جو بقول ریاض :

"کمرے اونچے پایوں کے نواڑی پلنگ پر بغیر بستر کے بنیائن اور دھوتی پہنے لیٹا رہتا چاروں طرف کی مسلیں رکھی ہوتیں - شمع جلتی رہتی کوٹھی کے برآمدے سے لیکر ہر کمرے کے دروازے پر پردے پڑے رہتے اور وہ دن کو رات بنائے ہوئے جام پر جام لنڈھائے جاتا"

حضرت ریاض کو اپنی پیشکاری میں لیا - آپ نے اپنا فرض منصبی کس خوبی سے پورا کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گورکھپور سے تبادلے کے بعد علیگڈھ میں پھر اس انگریز کو آپ کی ضرورت پڑی - حضرت ریاض حالانکہ اس تبادلے کے بعد ملازمت سے مستعفی ہو چکے تھے مگر پھر وہ اس کے پاس گئے اور چھ مہینے تک پھر ان کا قلم مسٹر ڈیوس کی سپر بنا رہا - گورکھپور میں پورا پولیس کا محکمہ اور کلکٹر ضلع حضرت ریاض کے فہم و تدبر کی وجہ سے مسٹر ڈیوس کا بال بیکا نہ کر سکے تھے یہاں بھی حضرت ریاض نے عزت کے ساتھ اس کو بری کرا کے چھوڑا - اسی زمانہ میں نواب کلب علی خاں کے دربار میں جہاں منیر - عروج - تجر - آغا حجو ہندی - قلق - امیر - داغ اور جلال وغیرہ مشاہیر فن جمع تھے آپ کی طلبی ہوئی - نواب صاحب نے خود فرمایش کر کے کلام سُنا اور سُنایا کلام سنکر حد درجہ محفوظ ہوئے خلعت اور زرِ نقد سے ممتاز کیا اور قیام کے لئے بھی عندیہ ظاہر کیا مگر آپ جس طرح حیدر آباد کی پابندی برداشت نہ کر سکے تھے اسی طرح رامپور بھی ٹھہر ناگوارا نہ کر سکے - سنہ ۸۳ء میں گورکھپور ہی سے آپ نے "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" جاری کیا جو ادبی لطائف اور ذوقِ سخن کے اعتبار سے اپنا ثانی آپ تھا -

سنہ ۸۴ء میں جب "فتنہ" اور "ریاض الاخبار" میں پولیس کے خلاف مسلسل مضامین لکھے جا رہے تھے تو ایک مرتبہ ان پر حملہ بھی ہوا اور وہ مجروح بھی ہوئے ، جس کے تفصیلی ذکر سے اس زمانے کے اخبارات بھرے ہوئے ہیں - سنہ ۸۵ء میں روزانہ "صلح کل" ایک لمیٹیڈ کمپنی قایم کر کے جاری کیا جس کے اسسٹنٹ اڈیٹر سید جالب دہلوی تھے بعد کو یہ اخبار مولوی سبحان اللہ خانصاحب کی ملکیت میں آگیا - ان اخباری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایک اور ادبی شغل بھی جاری تھا -

سنہ ۹۰ء اور سنہ ۹۱ء میں حضرت ریاض نے رینالڈس کے دو ناول لوز آف دی حرم اور مس ایلن پرسی کا ترجمہ (انگریزی نہ جاننے کے باوجود ایک انگریزی داں دوست کی مدد سے اس طرح کہ وہ ترجمہ سُناتے جاتے تھے اور آپ اس کو اپنی زبان میں اور اپنے انداز میں ڈھالتے جاتے تھے) "حرم سرا" اور "نظارہ" کے نام سے شایع کیا "نظارہ" میں یہ التزام رکھا تھا کہ پورے ناول میں ایک جگہ بھی کوئی لفظ اضافت کے ساتھ نہیں آیا ہے - سنہ ۱۹۰۰ء میں حضرت ریاض جو گورکھپور کی خاک میں ملنے کے آرزومند تھے اور جو یہاں خیر آباد میں

بھی اب اس طرح رہتے تھے گویا ہر وقت عازم گورکھپور ہیں، بالآخر مہاراجہ محمود آباد کے اصرار سے مجبور ہوگئے اور معہ ریاض الاخبار کے لکھنؤ چلے آئے۔ یہ مہاراجہ محمود آباد ہی کی کوشش تھی جس نے ان سے نہ صرف گورکھپور چھڑایا بلکہ یہ بھی کہلا دیا کہ :

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب　　جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

قیام لکھنؤ کے زمانہ میں ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں بہادر رشک فرمانروائے رامپور کی طرف سے صاحبزادہ مصطفےٰ علیخاں بہادر مرحوم دو مرتبہ اس قصد سے لکھنؤ آئے کہ ریاض کو رامپور لیجائیں تیسری مرتبہ ہز ہائی نس نے راجہ نوشاد علی خاں تعلقدار میلارائے گنج سے فرمایا کہ آپ حضرت ریاض کو لائیں مگر آپ پھر بھی نہ جا سکے۔ آخر سنہ ۹ء میں ایک ناکردہ گناہ کو الزام قتل سے بری کرانے کی کوشش کے سلسلہ میں حضرت ریاض خود ایک اطلاعی تار دیکر رامپور پہونچے باریابی کے لئے ۱۰ بجے شب کا وقت ملا، ملاقات کے وقت حالات معلوم ہونے کے بعد چیف سکریٹری کو طلب کیا کچھ مشورے کے بعد ریاست کے ایک یوروپین افسر بلائے گئے جن سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی پھر نواب صاحب بہادر رامپور نے دستِ خاص سے گورنر صاحب بہادر کے نام ایک چٹھی لکھکر دی، حضرت ریاض چٹھی لیکر مہاراجہ محمود آباد کے ہمراہ شملے گئے بٹلر صاحب نے چٹھی ملاحظہ فرما کر حضرت ریاض کو جب باریاب کیا تو سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ آپ ہندوستان میں سب سے بڑا شاعر ہے۔ حضرت ریاض کی یہ غزل اسی زمانہ کی اور اسی واقعہ کی یادگار ہے :

ہے پری خانہ کوئی شیشۂ در ٹوٹ نہ جائے　　سر نہ ٹکراؤں میں شملہ میں کہ سر ٹوٹ نہ جائے
دیکھنا مجھکو چڑھا لائی کہاں بن کے کمند　　آس اک چیز ہے دنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے
ابر کوہسار کے آگے نہ ہنسی ہو تیری　　تار اشکوں کا کہیں دیدۂ تر ٹوٹ نہ جائے
تارے ہٹتے ہی نہیں اپنی جگہ سے اے چرخ　　شبِ غم کی کہیں امید سحر ٹوٹ نہ جائے

مئے سُرخ، ابرِ سیہ، سبزۂ کہسار ریاض
یہ کوئی چیز نہیں تو بہ اگر ٹوٹ نہ جائے

لکھنؤ میں حضرت ریاض نے ایک انجمن اصلاح سخن بھی قایم کی تھی جس کے سکریٹری خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت تھے کلچین کا دفتر بھی ریاض الاخبار کے ساتھ اور وسیم صاحب مرحوم کا قیام بھی حضرت ریاض کے ساتھ لکھنؤ ہی میں تھا ایک ناکردہ گناہ کو الزام قتل سے بری کرانے کی سعی کے نتیجے میں مجرم کو پھانسی تو نہیں ہوئی مگر کالا پانی ہوگیا اس سے حضرت ریاض اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ قبل از وقت بوڑھے ہوگئے اور ان کی بڑی اور کھڑی مونچھیں لمبی اور نیچی داڑھی میں بدل گئیں یہاں تک کہ اپنے اخبار وغیرہ سے بھی انھوں نے قطع تعلق کرلیا اور محمود آباد کی پنشن پر قناعت کرکے خیرآباد میں خانہ نشین ہوگئے۔

حضرت مرحوم سفر سے بہت گھبراتے تھے برسوں مہاراجہ محمود آباد سے ملنے لکھنؤ نہیں جاسکتے تھے حتّیٰ کہ مہاراجہ مرحوم نے ریاض صاحب مرحوم کے متعلق ایک مرتبہ ایک دوست سے یہ تک کہدیا کہ میں ریاض کو اور ریاض مجھے آنجہانی سمجھتے ہیں حضرت مرحوم نے جب یہ لطیفہ سُنا تو کہنے والے سے کہا کہ یہ طالب اور مطلوب کے راز و نیاز ہیں اسی سفر سے گھبرانے اور مہاراجہ کی محبت سے متعلق ایک واقعہ سننے کے قابل ہے۔

مہاراجہ صاحب محمود آباد ایک مرتبہ لکھنؤ سے کلکتہ تشریف لیجارہے تھے حضرت ریاض مرحوم اندازہ کرکے ایسے وقت پہونچے کہ زیادہ ٹھہرنا نہ پڑے مہاراجہ نے اپنے موٹر میں آپ کو بٹھا لیا اور کہا اسٹیشن تک تو چلئے اسٹیشن پہونچکر مہاراجہ ٹرین میں رونق افروز ہوے

اور آپ کو بھی یہ کہکر کر ریل چھوٹتے وقت اُتر جایئے گا اپنے پاس ہی بٹھائے رکھا۔ گاڑی چلدی اور مرحوم نہ اُتر سکے اسی حالت میں کلکتہ پہونچے وہاں مہاراجہ نے خاطر کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا پھر بھی ایک دن پوشیدہ اسٹیشن آئے اور خیر آباد آگئے سب سامان وہیں چھوڑا اور ایک عریضہ یہ لکھ کر سامان کے ساتھ رکھدیا۔

سنہ ۱۷ء میں سیتاپور میں بہ یادگار امیر ''امیر المطابع'' قایم کیا اس پریس میں حرم سرا کا دوسرا اڈیشن شایع ہوا اور یہیں سے اپنے ماموں زاد بھائی جناب سید محمد عسکری صاحب وسیم کے اہتمام سے آپ نے پھر ''دامن گلچیں'' کی یاد میں ''گلچیں'' جاری کیا۔

حضرت ریاض نے نقاد میں نیاز صاحب کا مضمون ''ایک رقاصہ سے'' دیکھا اور اسے اپنے گلچیں میں اپنے قلم سے ایک نوٹ لکھکر نقل کیا یہ ابتدا ہے نیاز صاحب اور ریاض صاحب کے تعلقات کی اور انتہا یہ ہوئی کہ انتقال سے چار سال پیشتر نیاز صاحب نے حضرت ریاض کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے خود نوشت سوانح پبلک کے لئے وقف کر دیں چنانچہ حضرت مرحوم نے سنہ ۳۰ء میں اس کا آغاز بھی کر دیا تھا جو افسوس ہے کہ مکمل نہ ہو سکا۔

حضرت مرحوم کی تمام صفات میں ام الصفات ان کا خلوص تھا۔ وہ بہت جلد دوسروں کی نسبت اچھی رائے قایم کر لیتے تھے وہ محبت کے پتلے تھے۔ ان کی مذہبیت بھی رواداری کا عجیب و غریب نمونہ تھی وہ سُنّی تھے مگر مناظرہ سے ہمیشہ سے متنفر رہے وہ وارثی تھے مگر احرام کبھی نہیں باندھا وہ مسلمان تھے مگر جواہر لال کی وقعت کرتے تھے وہ ہندوستانی تھے مگر انگریزوں کی ہر بات کو خواہ مخواہ برا نہ کہتے تھے۔

نماز پانچوں وقت پڑھتے تھے اور خضوع و خشوع سے، روزے تیسوں رکھتے تھے اور .... اس عمر میں بھی اسی انہماک استغراق .... اور لطف و دلچسپی کے ساتھ زندہ تھے جیسے وہ جوان جسے مستقبل میں اپنی محنت اور اپنی عمر سے بہت سی امیدیں ہوں۔

.... اس ضعیفی میں بھی ان کی محنت کا یہ عالم تھا کہ اپنا پورا دیوان مسودوں سے خود ہی صاف کیا اس کے ان سب خطوں کا جواب جو ملک کے ہر گوشے سے ہر روز ان کے نام آتے رہتے تھے خود لکھتے تھے اور خوشنویسی اور انشا پردازی کے پورے شرائط کے ساتھ لکھتے تھے۔ وہ آخر عمر تک بغیر چشمہ لگائے لکھ لیتے تھے اور چاندنی میں پڑھ سکتے تھے۔

جناب نیاز فتحپوری کے نام ان کا ایک خط ملاحظہ ہو، جس میں انھوں نے اپنی صحت قوا پر خود اظہار رائے کیا ہے:

بیس شوال کا مضمون نثر میں سنئے: میں باہر لکھ رہا تھا اندر سے پیام آیا، اسپتال کی دائی کو بلوا دیجئے۔ آدمی گیا دائی کے بدلے لیڈی ڈاکٹر آئی ایک گھنٹے کے بعد وہ یہ کہتی ہوئی نکلی۔ ڈبل فیس ایک نہ شد دو شد، بھائی بہن توام۔ تانگے کا کرایہ بدقت دیا اور فیس کے لئے جھوٹے وعدے کرنا پڑے — بچوں کی تعداد بفضلہ ایک اوپر نصف درجن، مجھے دیکھئے میری عمر دیکھئے۔

اس شیخ کہن سال کی اللہ ری بزرگی
جنت میں بھی یہ جائے جواں ہو نہیں سکتا

۲۰ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء مطابق ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۳ھ ۸۰ سال کی عمر میں ریاض نے انتقال کیا اور خیر آباد میں سپرد خاک کئے گئے

سید عقیل احمد جعفری

ریاضؔ کی شاعری

کل کی اُردو شاعری میں ریاضؔ خیرآبادی کا شمار بھی بڑی شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ میں "کل" کا لفظ قصداً استعمال کرتا ہوں کیونکہ آج کے پڑھنے والوں کو اُن کے کلام کا زیادہ حصّہ مصنوعی نمایشی اور بے وقت کی چیز معلوم ہوگا۔ افسوس کی بات ہے کہ اُن کا دیوان اب سے بہت پہلے شایع نہ ہوا، تیس سال قبل اس کی مانگ بہت زیادہ ہوتی، کیونکہ اُن کے بہت سے قدرداں اور شاگرد اس وقت موجود تھے، وہ اسی لہجہ میں بات کرتے تھے، جس سے لوگ مانوس تھے، وہی محاورے استعمال کرتے تھے جنھیں اپنے یہاں لانے کی دوسرے لوگ بھی کوشش کرتے تھے، وہ اُن عنوانات پر نغمہ سرائی کرتے تھے جن میں اُس وقت جذبات کو اُکسانے کی طاقت موجود تھی، وہ ایسے رموز و اشارات لاتے تھے جو ابھی تک بے اثر نہیں ہوئے تھے، وہ نرمی سے اُس زندگی کی سطح کو چھوتے تھے جو ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ یعنی جس میں گہرائی کے باوجود صفائی، شایستگی تھی لیکن اضمحلال نہ تھا، جس میں جوش و خروش نہ ہونے پر بھی طاقت تھی، یعنی وہ زندگی جو مینا کی طرح لبالب تھی لیکن ایسی نہیں کہ چھلک جائے، لیکن جو زیادہ جئے گا اسے بعد از وقت جینا پڑے گا، اس لئے جب تک ریاضؔ اپنی زندگی کا سفر ختم کریں کریں، لوگوں کے خوابوں کی دُنیا بدل چکی تھی، روایتی خیال آفرینی سے علحدگی کی ابتدا ہورہی تھی، قومیت شاعری کا عام موضوع بنتی جارہی تھی اور اُن لوگوں کے خلاف ایک طرح کا جذبۂ مخالفت پیدا ہوتا جارہا تھا جو ابتدائی دور کے اسلوب اور رنگ سے تعلق رکھتے تھے۔

اس میں بہت شک ہے کہ آج اُردو شاعری کا مطالعہ کرنے والا ریاضؔ کو کوئی خاص اہمیت دے گا! اور کئی حیثیتوں سے یہ بات قابلِ افسوس ہے کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس دنیا میں انھوں نے اپنی شاعری کو محدود کرلیا تھا اُس کے وہ ماہر تھے نقاد کو انھیں شرطوں پر نگاہ رکھنا چاہئے، جنھیں شاعر اپنے اوپر آپ عاید کرتا ہے اور انھیں معیاروں سے جانچنا چاہئے جو وہ پیش کرتا ہے۔ یہ اُس کی غلطی نہیں ہے کہ وہ کوئی اور کیوں نہیں ہوا اور نہ یہ اُسکے بس کی بات تھی کہ اُس نے کچھ اور کیوں نہیں لکھا انقاد جو کچھ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں وہ صرف اتنا ہے کہ اس کے کلام میں دیر تک زندہ رہنے والے عناصر کتنے ہیں؟ کیا اس کلام کا تخاطب کسی ابدی انسان سے ہے؟ اس میں ذہن انسانی سے باہر کی زندگی اور فطرتِ انسانی کے بنیادی اور نہ جُدا ہوسکنے والے اجزا کا کس حد تک ذکر کیا گیا ہے؟ کیا اس کلام سے صرف زنہ کے انوکھے پن کا اظہار ہوتا ہے، اور اس کا شمار ادبی عجائبات میں ہوسکتا ہے؟ کیا یہ ایسا کلام ہے جو اپنی اندرونی اور داخلی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے محفوظ رکھا جائے گا کہ اس کو تاریخی وقدیمانہ اہمیت حاصل ہے؟ جس طرح ہر مصنف اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے ٹھیک اُسی طرح اس کی اپنی ذات بھی ہوتی ہے، لیکن ایک بڑا مصنف اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہوتا ہے، وہ ماضی و حال کی پیداوار ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کا پیامبر بھی ہوتا ہے وہ خود بھی ہوتا ہے اور ہر شخص بھی۔ یہی عظمت کا معیار ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ ریاضؔ کہاں تک اس پر پورے اُترتے ہیں؟

ریاضؔ خیرآباد ضلع سیتاپور کے رہنے والے تھے، اُنھوں نے عملی زندگی کی ابتداء ایک پولیس افسر کی حیثیت سے کی جب اُنھوں نے یہ غیر شاعرانہ پیشہ ترک کر دیا تو اُن کے وقت کا زیادہ حصہ صحافت نگاری میں صرف ہوتا تھا۔ اُن کے مضامین عام دلچسپی رکھتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ نثر میں انھوں نے دو ناول بھی لکھے۔ امیرؔ مینائی کے شاگرد ہو گئے جیسا کہ خود ہی کہتے ہیں:۔

مست مینا ہوں پیا ہے میں نے — جام امیر احمدِ مینائیؔ کا،

میرؔ، مینائیؔ اور مصحفیؔ کو وہ اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ اول الذکر کی جانب ان اشعار میں اشارہ ہے

اب کہاں شستہ زباں میرؔ کی افسوس ریاضؔ! — میرؔ کا رنگ تغزل بھی گیا میرؔ کے ساتھ

کچھ کچھ ہے ریاضؔ میرؔ کا رنگ، — کچھ شان ہے ہم میں مصحفیؔ کی

اُٹھتی ہے اب جہاں سے میرؔ کی طرز — کہ ریاضؔ اب جہاں سے اُٹھتا ہے

ریاضؔ کے پاس اعانت کی پیشکش نظام حیدرآباد اور مہاراجہ سرکشن پرشاد دونوں کے یہاں سے آئی لیکن وہ مہاراجہ محمود آباد ہی کی سرپرستی پر قانع رہے۔ اُن کے اشعار میں بہت سے اشارے، مہاراجہ کی طرف ہیں، ان میں سے بعض تو اسی بھونڈے انداز کے ہیں جو اٹھارویں صدی کے انتسابات میں پایا جاتا ہے

کہنے کو ہمارے بھی ہیں اشعار بہت خوب — سچ یہ ہے کہ فرماتے ہیں سرکار بہت خوب

ضعفِ پیری سے ریاضؔ اب نہیں اُٹھا جاتا — گاہے گاہے کبھی جا رہتے ہیں سرکار کے پاس،

مری افسوں طرازی کی ریاضؔ اتنی جو شہرت ہے — سبب یہ ہے کہ ساحرؔ سا ملا ہے قدرداں مجھ کو

ساحرؔ مرحوم مہاراجہ محمود آباد کا تخلص تھا۔

مشکل ہی سے ایسا لکھنے والا دکھائی دے گا جو عاقلانہ تراش خراش اور اخراج سے اپنی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ نہ کرتا ہو۔ یہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ سب سے بڑا فن انتخاب ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی صاحبِ قلم ہر وقت اپنے بہترین رنگ میں نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ہومرؔ بھی اونگھ جاتا ہے۔ اور کہیں کہیں اچھے سے اچھے لکھنے والے کی تحریر بھی محض لفاظی، ڈھیلے پن اور بھرتی سے بدنما ہو جاتی ہے۔ کارلائل کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ گیوٹے کی معمولی باتوں کی بھی تعریف کرے لیکن بیکاری کے اوقات میں بے سوچی سمجھی ہوئی تحریر پست درجے کی خنکاری اور نقالی ایک مصنف کی کتابوں کی قدر و قیمت ضرور گھٹا دیتی ہیں۔ ان میں کسی طرح کی فنی خوبی نہیں ہوتی البتہ ایک طرح کی شخصی اور تاریخی اہمیت ہو سکتی ہے۔ مذاق بدل جاتے ہیں۔ سماجی رکاوٹیں جس طرح مزاج بدلتی ہیں نام بھی بدل دیتی ہیں۔ ممنوعات پیدا ہوتے اور مٹتے ہیں۔ آج جسے پست اور عریاں کہہ کر ٹھکرا دیا جا رہا ہے کل اُسی کو اعلیٰ درجہ کی حقیقت نگاری کہہ کر سراہا جا سکتا ہے۔ تاریخ ادب لوگوں کے اس رویّہ پر کہ کیا کھل کر کہہ سکتے ہیں اور کیا نہیں، بڑی دلچسپ روشنی ڈالتی ہے۔ بیچارے ڈاکٹر باوڈلر نے فیملی شیکسپیر (Family Shakespeare) شایع کر کے ایک طرح کی ناقابلِ رشک شہرت حاصل کر لی لیکن ہر نسل اور ہر دور کے پاس اپنے ادبی اور فنی ڈاکٹر باوڈلر ہوتے ہیں۔ پوپ کی فہرست ممنوعات اور برطانیہ

۱؎ ڈاکٹر باوڈلر نے شیکسپیر کے ڈراموں کی کانٹ چھانٹ کر اپنے خیال کے مطابق ایسا بنا کر شایع کیا تھا کہ گھر کے چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے سب پڑھ سکیں۔ کوئی بات اخلاق سے گری ہوئی نہ ہو۔ اس طرح اخلاقی نقطۂ نظر سے کانٹ چھانٹ کرنے کے لئے انگریزی میں (Bowdlerize) ایک لفظ ہی بن گیا ہے۔ مترجم

کی فہرست ضبطی و احتساب بھی یہی مقصد پورا کرتی ہیں۔ موجودہ شاعری، افسانہ اور آرٹ نے مل کر بہت سی پرانی دیواروں کو گرا دیا ہے اور بہت سی قدیم پابندیوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اگرچہ وکٹر ہیوگو نے کہا ہے کہ شاعری میں اچھے اور بُرے موضوع نہیں ہوتے تاہم سچ یہ ہے کہ ایک زمانہ کا اندازِ گفتگو دوسرے زمانہ میں متروک ہی نہیں ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ یہ صرف فنّی قواعد و اسلوب کا سوال نہیں ہے۔ اب سے تیس سال پہلے مشاعروں میں جو کچھ کھلم کھلا پڑھا جا سکتا تھا آج کے لوگ اُسے سُن کر کان بند کر لیں گے۔ اکبر جیسے شاعر کے یہاں سے بھی بعض حصّے موجودہ مذاق کے لئے ناگوار سمجھ کر نکال دئے جائیں گے۔ خود ریاضؔ کے یہاں ایسے اشعار ہیں جنھیں مشتبہ مذاق کی وجہ سے رد کرنا پڑے گا۔ اب سے پچھتّر سال پہلے جب اُن کی جوانی تھی اُردو شاعری سے دلچسپی لینے والے خاص خاص حلقوں میں یہ اشعار مزے لے لیکر پڑھے جاتے تھے، آج کے پڑھنے والے ان سے خوش نہیں ہو سکتے۔

ناصح کے سر پہ ایک لگائی تڑاق سے، ــ پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں
شامِ شبِ وصال مری بے قراریاں ــ اُن کا دبی زبان سے کہنا ابھی نہیں
ہم لاکھ پارساؤں کے اک پارسا سہی ــ موقع سے تم کو پائیں تو بتلاؤ کیا کریں
جو بے حجاب کہیں سینہ تانے جاتے ہیں ــ کھلے خزانے وہ جوبن لُٹانے جاتے ہیں

میرؔ کے زمانے سے اس وقت تک اُردو بہت بدل گئی ہے۔ بحریؔ اور میرؔ کی طرح کے قدیم شعراء جو اُردو زبان استعمال کرتے تھے اُس میں ہندی لفظوں کی کافی آمیزش تھی۔ شعرائے مابعد بالخصوص غالبؔ اور ناسخؔ کے اثر سے یہ رجحان فارسیت کی جانب زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہو کہ افعال اور متعلقاتِ فعل کو چھوڑ کر موجودہ اُردو کے کسی جملہ کا کوئی جزو بھی ہندوستان یا ہندوستان کی کسی زبان سے مشکل ہی سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ اُردو کے کسی معروف رسالہ میں سے بغیر کاوش کے کوئی عبارت لے لیجئے تو ثابت ہو جائے گا کہ میں مبالغہ آمیزی کے رائج الوقت تفریح کا ارتکاب نہیں کر رہا ہوں۔

بدقسمتی سے اُردو زبان ٹھیک اسی طرح تقریباً فارسی ہو گئی ہے جس طرح برج بھاشا کے زوال کے بعد سے ہندی زیادہ سے زیادہ سنسکرت کے قریب پہونچ گئی ہے۔ سادہ اور عام فہم الفاظ کو رد کر کے مشکل اور نامانوس سنسکرت لفظوں کو اُن پر ترجیح دی گئی ہے۔ الزام لگانے سے کوئی فائدہ نہیں، دونوں زبانوں کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی ذمہ داری اُردو اور ہندی دونو کے لکھنے والوں پر برابر ہے۔

ریاضؔ کا تعلق شعراء کے اس گروہ سے تھا جو موقعہ اور مناسبت کے لحاظ سے ہندی لفظ استعمال کرنے میں تامل نہ کرتا تھا۔ ریاضؔ کے یہاں اُن ہندی لفظوں کی بڑی تعداد ملتی ہے جن کے اخراج سے اُردو زبان مفلس ہو گئی۔ مثلاً اُن کے یہاں ایسے الفاظ ملتے ہیں؛

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ ــ زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا
آئیں میری بزمِ ماتم میں وہ کیا؟ ــ ہاتھ میں منہدی رچی اچھی نہیں
ہم لیں بلائیں زلف کی وہ رات بھی تو ہو ــ آئے مزے کی رت کہیں برسات بھی تو ہو
عدو کی شبِ وصل سو بار صدقے ــ شبِ غم ہے کتنی سہانی ہماری
بڑی نٹ کھٹ بڑی چنچل ہے طبیعت میری ــ ----------
برسات کی رت لطف کی ہے رات مزے کی ــ بلوا دے مجھے رندِ خرابات مزے کی

مری شمعِ لحد ہنس ہنس کے بڑی ہے

مجھ کو ارمان منائے کوئی میرے دل کو — اُن کو یہ ہٹ کہ خفا ہے تو خفا رہنے دو

اب دل ہے ریاضؔ اور نہ وہ دل کی تمنا — منجدھار میں ہم کشتیِ امید ڈبا آئے

ہوائے گرمِ خزاں میں وہ رنگ روپ کہاں

زبان کے ذکر ہی کے سلسلہ میں ریاضؔ کے اُس حیرت خیز حد تک صاف اور شگفتہ اسلوب بیان کے بارہ میں بھی دو لفظ کہہ دینا چاہئے جس کے وہ ماہر تھے۔ اُن کی شاعری کی خوبیوں پر اختلاف رائے کی گنجائش ہے لیکن اُن کے فنِ شعر گوئی پر صرف ایک فیصلہ صادر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ اُن کا طرزِ ادا حرف گیری سے بلند تھا، زبان اور لغات پر اُن کی قدرت قابل داد تھی اور روزمرہ کی شاعری کے کلام میں لانے کی قابلیت حیرت انگیز۔ وہ محاورات کے بادشاہ تھے۔ ان کی شاعری صرف بچے تلے مرصّع فقروں اور نازک لفظوں کی محتاج نہ تھی پڑھنے والا بار بار فقروں کے خلافِ امید موڑ، شگفتہ ترکیبوں، متحیر کردینے والے برمحل کنایوں اور متعلقات فعل سے دوچار ہوتا ہے۔ شاید یہ اُردو شاعری کی بدبختی ہے کہ لفظی تراش خراش پر اس قدر زور دیا جاتا ہے۔ مشاعروں میں اشعار کی تعریفیں سننے میں آتی ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ ان تعریفوں کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ مشکل ہی سے کبھی توجہ خیال یا محاکات کی طرف جاتی ہے۔ نئے قافیہ کے استعمال، پُرانے قافیہ کے نئے استعمال، ردیف کے فن کارانہ صرف، اور متروک الفاظ سے اجتناب انھیں باتوں کے لئے شاعر کی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن جہاں ایک طرف اس سے شاعری کو نقصان پہونچتا ہے، زبان کو یقینی طور پر فایدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص طرزِ ادا میں سبقت لیجانے کی مشقتیں برداشت کرتا ہے۔ اِس خوبی کی نمایندگی کے لئے ریاضؔ سے بہتر شخص کا پانا مشکل ہے وہ ایک ہی خیال کو بیسیوں طریقوں سے ادا کرتے ہیں۔ ایک ہی تصویر سیکڑوں بار پیش کرتے ہیں لیکن ہر دفعہ طریق اختیار میں ایک نیا پن ہوتا ہے جو اُسے یکسانیت سے بچاتا ہے۔ بحروں کے حُسنِ استعمال میں تو ریاضؔ معجز نمائی کرتے ہیں بحر چھوٹی ہو یا بڑی، اوزان کیسے ہی مشکل ہوں، ریاضؔ اپنی روانی اور سجاوٹ کو برقرار رکھتے ہیں اور کسی طرح کی دشواری میں مبتلا نہیں دکھائی دیتے۔ کیا اُن کا یہ غرور قابل معافی نہیں ہے؟

واہ کیا رنگ ہے کیا خوب طبیعت ہے ریاضؔ — ہو زمیں کوئی تمھیں پھولتے پھلتے دیکھا

اپنی فطری سوجھ بوجھ اور کہنہ مشقی کی مدد سے ریاضؔ اپنے روزمرہ میں وہ اثر پیدا کرلیتے ہیں جو دوسرے لوگ اونچے، غیرمانوس اور "شاعرانہ" الفاظ کے استعمال سے پیدا کرتے ہیں مثلاً :-

خدا جانے ہوا کیا کوچۂ جاناں میں دل جاکر — میرا بھولا ہوا بھٹکا ہوا اب تک نہیں آیا

مرکے ہم دادِ وفا دیں تو بھی کچھ پرسش نہیں — یونہی سی ہے حُسن کی سرکار کچھ یونہی سی ہے

یا جیسے ؎ ضعفِ پیری جو بڑھا موت کے پیغام چلے — آگیا وقتِ سفر صبح چلے شام چلے

ایک جگہ پر کیسی سچی بات کہی ہے:

پینے کا یہ اثر ہے وہ کوثر کی ہو نہ ہو — پاکیزہ، شستہ، صاف ہماری زبان ہے

پاکیزہ، شستہ اور صاف، یہی تین لفظ پورے طور سے اُن کے انداز بیان کی خصوصیتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ع

میرے کلام میں ہے مزا بول چال کا

کچھ تو اس مکتب شاعری کی روایات کی وجہ سے جس سے اُن کا تعلق تھا اور کچھ خود اپنے رنگِ طبیعت کے سبب ریاضؔ کے کلام میں تفکر اور کرختگی کی جگہ شستگی اور لطافت ہے۔ جس طرح شاعر کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ علمائے دین کی جگہ لے لے اُسی طرح یقیناً اُس کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ وہ فلسفہ کے اصول بتائے۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے شاعری کو صاف ستھری تک بندیوں سے کچھ زیادہ ضرور ہونا چاہئے۔ کیٹس نے ٹھیک کہا تھا کہ فلسفہ فرشتے کے پر کتر دیتا ہے۔ کسی اور رنگین نوا کی آواز ہے "مردہ فلسفہ سے اپنی روح کو پریشان نہ کرو، کیا ہمارے پاس بوسہ لینے کے لئے ہونٹ، محبت کرنے کے لئے دِل اور نظارے کے لئے آنکھیں نہیں ہیں!" — لیکن حقیقی شاعر پیمبر بھی ہوتا ہے۔ کولرج، مانٹ بلینک کو دیکھتا ہے:-

"تو میرے خیال سے نکلا لیکن میرے مادی احساس میں باقی رہ گیا۔ عبادت میں محو ہو کر میں نے صرف ان دیکھے کی پرستش کر لی"۔

اُس کے پاس دقتِ نظر ہونا چاہئے، وہ محض ہیجانات پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ ریاضؔ کے یہاں خیال کا جوہر معمولی ہوتا ہے حالانکہ کبھی کبھی وہ گہری باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ اُن کے کلام کے اکثر حصّوں سے اِس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اُنھوں نے جو کچھ اپنے گیتوں میں سُنایا ہے اُسے غم و الم کی دنیا میں سیکھا بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے صرف زندگی کی سطح کو چھوا ہے اگرچہ اُس سطح پر وہ مخصوص سبک خرامی دکھاتے ہیں۔ چند شعر سنئے جن میں وہ بلندیوں پر جاتے اور گہرائیوں میں اُترتے ہیں، جہاں وہ غم کا جذبہ پیدا کرتے اور مصائب کے راستہ پر چلتے ہیں اور یہی راستہ اُس دنیا میں پہونچاتا ہے جہاں غم نہیں بستا۔

قفس میں ہم تھے گھری بادلوں میں بجلی تھی — تڑپ تڑپ کے رہے دونوں آشیاں کے لئے

وہ کون ہے دنیا میں جسے غم نہیں ہوتا — کس گھر میں خوشی ہوتی ہے ماتم نہیں ہوتا

ہم تھک کے گرے، گر کے اُٹھے اُٹھ کے چلے بھی — کچھ پر اثر اے دوری منزل نہیں ہوتا

بھٹکا ہوا خیال ہے عقبیٰ کہیں جسے — بھولا ہوا سا خواب ہے دنیا کہیں جسے

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے — ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی مگر — جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

اجل خدا کے لئے رحم کر حسینوں پر — ملا کے خاک میں حسن و جمال کیا ہوگا

میں کون ہوں کیا ہوں نہیں معلوم کہاں ہوں — مجھ سا کوئی بے نام و نشاں ہو نہیں سکتا،

کہیں بھی جائیں کہاں آسماں نہیں ملتا — لحد ہی ایک جگہ ہے جہاں نہیں ملتا

اے جوانی نہ جا بہار کے ساتھ — وہ تو آئے گی ایک سال کے بعد

خاک میں ملنا ہے تو کیسا غرور، — خاک میں ملنا ہے تو کیسا گھمنڈ

آئی آنے کو فصلِ گُل سو بار، — میرے دل کی کلی کھلی ہی نہیں

فسردہ دل ہوں مجھے کیا ہے کوئی موسم ہو — بھری بہار میں کیا تھا جو اب خزاں میں نہیں

جن کے دل میں ہے دردِ دُنیا کا، — وہی دُنیا میں زندہ رہتے ہیں،،

جو مٹاتے ہیں خود کو جیتے جی — وہی مر کر بھی زندہ رہتے ہیں،،

بڑی کوئی نٹ کھٹ ہے یارب قضا بھی　　　چُنے بانکے ترچھے جواں کیسے کیسے

ایسے اشعار بھی ریاض کے یہاں پائے جاتے ہیں جن میں ہلکا پھلکا کھلنڈرا پن، شوخی اور تمسخر نمایاں ہیں اور ایسے تو بہت ہیں جن سے مسرت اور خوشدلی کا اظہار ہوتا ہے۔ ریاض مشکل ہی سے نالہ و ماتم کا وہ نیم مردہ انداز اختیار کرتے ہیں جو اکثر اُردو کی عشقیہ شاعری کی خصوصیت کے طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ کبھی عاشق کو اس قابلِ رحم گداگر کے درجہ تک نہیں گراتے جو ایک نگاہِ لطف کا پیاسا اور ادنےٰ تسلی کا بھوکا ہوتا ہے۔ اور جو پامال ہونے اور روندے جانے کے لئے ہر لمحہ طیار رہتا ہے۔

هم گزرے جس طرف سے اُدھر اُنگلیاں اُٹھیں　　　دیوانہ ان حسینوں نے ہم کو بنا دیا
دیکھئے گا سنبھل کے آئینہ،　　　سامنا آج ہے مقابل کا

ایک ایسا ہی شعر جرأت کے یہاں بھی ملتا ہے:

کیوں ہو حیران سے کیا آئینہ دیکھا پیارے　　　کچھ تو بولو کہ یہ کس نے تمھیں خاموش کیا

ریاض کے بعض اور اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بنالوں خدا تو بھی میرے نہ ہوں گے　　　بتوں میں کوئی بھی ہوا ہے کسی کا؟
کیا قیامت ہے شبِ وصل خموشی اُس کی　　　جس کی تصویر کو بھی ناز ہے گویائی کا
کبھی قیس دیوانہ آتا جو مجھ تک　　　مرے پاس سے بن کے انسان جاتا
نہ دیکھتے تھے کبھی جو نظر اُٹھا کے مجھے　　　وہ دیکھتے ہیں دمِ حشر مسکرا کے مجھے
حسینوں کا عالم نیا ہو رہا ہے　　　کہ جس بُت کو دیکھو خدا ہو رہا ہے

داغ کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں　　　ایسی جنت کو کیا کرے کوئی،

ریاض کا شعر ہے: ہے فرشتوں کے برابر عمرِ حور،　　　کیا تمنا ایسی لمسِن کے لئے

اور میر کہتے ہیں:

اس کے کوچے نہ کر شورِ قیامت کا ذکر　　　شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں

ریاض کا دوسرا شعر دیکھئے:

ڈراتا ہے ہمیں محشر سے تو واعظ ارے جا بھی　　　یہ ہنگامے تو ہم نے روز کوئے یار میں دیکھے

ریاض کے بعض بہترین اشعار پیری کے موضوع پر ہیں۔ وہ بڑی شان سے بوڑھے ہوئے۔ جوانی کے اظہار کی کوشش اُن کے یہاں زبردستی نہیں معلوم ہوتی۔ کارج جب بوڑھا ہوا تو کہتا ہے:۔

"زندگی صرف خیال ہے اس لئے میں یہی سوچوں گا کہ جوانی اور میں ابھی تک ایک ساتھ رہتے ہیں"

اسی طرح ریاض بھی اگرچہ پیری میں بہارِ شباب کی طرف حریصانہ دیکھتے تھے لیکن جیتے رہے یہاں تک کہ پکے ہوئے پھل کی طرح آسانی سے ٹوٹ گئے انھیں جھٹکے سے توڑنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بڑی عمر کے مزے جوانی کے ولولوں کی طرح نہیں ہوتے لیکن عمرِ رفتہ پر نظر ڈالنے اور یادوں کو اکٹھا کرنے پر ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ بس ربابِ زندگی کے تار خاموش ہوگئے ہیں مردہ نہیں ہوئے ہیں۔

وہی شباب کی باتیں وہی شباب کا رنگ　　تجھے ریاضؔ بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

یہ کم نہیں ہے بڑھاپے میں ہم نے توبہ کی　　تمام عمر میں ہم نے یہ ایک کام کیا

کیوں جوانی آئی دو دِن کے لئے　　دِن گنے جاتے تھے اِس دِن کے لئے

جوانی کے نشہ میں کچھ سوجھتا ہے　　بڑھاپے میں اچھی بُری سوجھتی ہے

بڑے لطف سے دن گزر جاتے یہ بھی　　بڑھاپے میں ہم کو جوانی جو ملتی ،

ریاضؔ اب کہاں وہ جوانی کا عالم　　گلے سے لگاتے جوانی جو ملتی ،

یہ تو ہونا ہی تھا کہ ریاضؔ کے دیوان میں روایتی مضامین کے اشعار روایتی انداز میں پائے جائیں۔ لیکن ان موضوعات کو بھی وہ شگفتہ و شاداب بنا سکتے ہیں۔ تقدیر کے ظلم اور بے توجہی کو عام طور پر آسمان سے متعلق سمجھا گیا ہے۔

ذرا جو ہم نے انھیں آج مہرباں دیکھا　　نہ ہم سے پوچھئے کیا رنگِ آسماں دیکھا

ایک فرسودہ موضوع پر ایک شعر ملاحظہ فرمائیے :

کہتا ہے عکسِ حُسن کو رسوا نہ کیجئے　　ہر وقت آپ آئینہ دیکھا نہ کیجئے ،

جسے میں نے بعد کے لئے اُٹھا رکھا تھا وہی یقیناً ریاضؔ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ ریاضؔ شراب کی تعریف اور عظمت کے اظہار ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُس کے لئے اُن کے یہاں پرستش کا جذبہ ملتا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے شخص نے اُردو غزل کے خزانہ میں اس موضوع پر بعض لطیف ترین اشعار کا اضافہ کیا جو کبھی شراب کے نزدیک نہیں گیا۔ شراب کے لئے پرجوش اور ولولہ انگیز لہجہ کے استعمال نے فطرتاً لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ یہ سب صرف تخئیل کی نادرہ کاری نہیں ہو سکتی بلکہ شاعر ضرور شراب کی ان بوندوں سے آشنا تھا جو فکر کے چہرے کی تمام جھرّیاں مٹا دیتی ہیں۔ غالباً یہ اندازہ صحیح ہو گا کہ ریاضؔ کے دیوان میں تقریباً ۱۳۶۶ اشعار شراب کے موضوع پر ہیں۔ ایک قدیم لاطینی لطیفہ ہے "انسان کے شراب پینے کی پانچ وجہیں ہیں، اچھی شراب ہو، دوست ہو، طبیعت میں اضمحلال ہو یا اُسکے جلد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، یا ان سب کے علاوہ کوئی اور وجہ ہو"

اُردو شاعری فارسی شاعری کی روایتوں کی تقلید میں ساقی، شراب، توبہ، میخانہ، واعظ اور ایسے تمام دوسرے اشارات اور علامات سے بھری ہوئی ہے جو بعض لوگوں کو مادی دخترِ رز اور بعض کو حقیقی محبت اور عارفانہ سرور معلوم ہوتے ہیں۔ ان عنوانات پر کچھ ایسے اچھے اشعار بھی ہیں :

نہ ہم ہوش میں مے پرستی سے گزرے	ہوئے جب کہ بیہوش مستی سے گزرے	میر حسن
دور سے آئے تھے ساقی سُن کے میخانے کو ہم	بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم	نظیر
مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں	دِل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم	"
بہ گئے ہیں واعظا گرداب دورِ جام میں	زیست بھر ہوں گے نہ اس دریائے مے سے پار ہم	ناسخ
زاہد شراب پینے سے کافر بنا میں کیوں ،	کیا ڈیڑھ چلّو پانی میں ایمان بہہ گیا	ذوق
ذوق جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں مُلّا ،	اُن کو میخانے میں لے آؤ سنور جائیں گے	"
مسجد میں بلاتے ہیں ہمیں زاہدِ نافہم	ہوتا اگر کچھ ہوش تو میخانے نہ جاتے	امیر

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں — داغ
زاہد شراب ناب کی تاثیر کچھ نہ پوچھ — اکسیر ہے جو حلق سے نیچے اُتر گئی — "
جلوۂ ساقی و مے جان لئے لیتے ہیں — شیخ جی ضبط کریں ہم تو پئے لیتے ہیں — اکبر
میرے مذہب میں ہے واعظ ترک مے نوشی حرام — چھوڑ کر پیتا ہوں پھر توبہ اسی کا نام ہے — چکبست
سچ کہا تھا تو نے زاہد زہر قاتل ہے شراب — ہم بھی کہتے تھے یہی جب تک بہار آئی نہ تھی — جلیل
میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام جاؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا — غالب
مضطرب روح کوئی آ گئی میخانے میں — خود بخود مے کو ہے گردش مرے پیمانے میں — ناصری

لیکن میرے خیال میں یہ بات ضرور مانی جائے گی کہ شراب کے موضوع کو جس امتیازی شان سے ریاض نے پیش کیا ہے اس میں کوئی اور ان کا شریک نہیں۔ اُن کی تصویر کشی جذبات انگیز ہوتی ہے، اُن کے ساقی میں جسمانی حُسن اور کشش اور اُن کی شراب انگور کا شیرہ ہے۔ اُن کے پیالہ میں نشہ ہے جو حُسن اور عظمت کے منظر اُن کی نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔ لیکن فوری اور ہنگامی کیفیات سے گزر کر وہ ایک زیادہ طاقت ور اور مکمل شراب کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ اُن کا ساقی غیر مرئی ہو جاتا ہے اور ان کی بزم مے نوشی اور یاران میکدہ کی صحبت میں کوئی بات بھدی، قابلِ نفرت یا گندی نہیں رہ جاتی۔ اشتیاق اور خواہش، پرجوش مسرت اور فرحناک خود فراموشی، درد و غم پر فتح، میکدہ کا وہ راستہ جو یقینی طور پر تختِ خداوندی تک پہونچائے، زاہد خشک کے ساتھ تمسخر اور ان سب کے باوجود اندر ہی اندر ایک طرح کی سنجیدگی کی لہر یہی باتیں اُن کی خمریاتی شاعری کا جوہر، مواد اور نچوڑ ہیں۔

توبہ کرتے ہوئے آتا ہے یہ رہ رہ کے خیال — مُنھ مرا دیکھ کے رہ جائے گا ساغر میرا
میخانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر — مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا
رحمت کو یہ ادا مری شاید پسند آئے — ڈر ڈر کے کانپ کانپ کے پینا شراب کا
کوئی مست میکدہ آ گیا مے بیخودی وہ پلا گیا — نہ صدائے نغمۂ دیر اُٹھی نہ حرم سے شورِ اذاں اُٹھا
اے شوخ وہ کعبہ ہو یا ہو درِ میخانہ — تو نے مجھے جب دیکھا سجدے ہی میں سر دیکھا
کعبہ میں نظر آئے جو صبح اذاں دیتے — میخانے میں راتوں کو ان کا بھی گزر دیکھا
میخانے میں مزار ہمارا اگر بنا — دنیا یہی کہے گی کہ جنت میں گھر بنا
دیکھ واعظ مجھ کو میں کیا ہو گیا، — آدمی تھا پی فرشتہ ہو گیا
تجھے یہ مے ہی عذاب واعظ مجھے یہ مے ہی ثواب واعظ — عجیب شے ہو شراب واعظ مجھی کو عذاب تیرا
حشر میں دوں گا ایک کے دس دس، — دے مجھے قرض اے شراب فروش
کچھ مزے میں ہم آ گئے ایسے، — توبہ پینے سے ہم نے کی ہی نہیں
کسی سے ہائے ساقی کا یہ کہنا — لہو میرا پئیں جو بے پئے جائیں،
گھٹا اُٹھتے ہی بوچھاریں یہ ہم پر — ارے واعظ کہاں تک ہم پئے جائیں
میکدے والو ادھر بھی نگہ لطف رہے — دور سے کعبہ نشیں تم کو دعا دیتے ہیں

نہ لوں راہِ میخانہ کس طرح واعظ — یہ بادل جو سر پہ مرے چھا رہے ہیں
کمر سیدھی کرنا ذرا میکدے میں — عصا ٹیکتے کیا ریاضؔ آ رہے ہیں؟
جنابِ شیخ اُلجھتے ہیں کس تعلق سے — یہ دختِ رز کے کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں!
اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں،
مُنہ بناتا ہے بُرا کیوں وقتِ وعظ؟ — آج واعظ تو نے پی اچھی نہیں
بتکدے سے میکدہ اچھا مرا، — بیخودی اچھی خودی اچھی نہیں
کام میخانے کا ہو جائے گا بند — چشمِ ساقی کی حیا اچھی نہیں
شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا، — "ہے بہت ہی بد مزہ اچھی نہیں"
دھڑکے محشر کے مٹانے کی مرے ساقی نے — مرتے مرتے بھی پلائی ہے کئی خم مجھ کو
قدر مجھ رند کی تجھ کو نہیں اے پیرِ مغاں — توبہ کر لوں تو کبھی میکدہ آباد نہ ہو
خدا کے بندے کچھ ایسے نڈر ہیں لے ساقی — ہزار بار پئیں توبہ ایک بار نہ ہو،
توبہ لب پر وعظ سے بے اختیار آنے کو تھی — وہ تو کہئے بچ گئے فصلِ بہار آنے کو تھی
شیخ جی میکدہ وہ جنت ہے — تم بھی جا کر جوان ہو جاتے
سو رند پئیں تو نہ ہو خالی کبھی ساقی — ایسا بھی ترے میکدے میں جام کوئی ہے
حشر کی اتنی حقیقت ہو گی، — پاس میخانے کے جنت ہو گی
اتنی پی ہے کہ بعد توبہ بھی — بے پیئے بیخودی سی رہتی ہے
اچھی پی لی خراب پی لی — جیسی پائی شراب پی لی
پی لی ہم نے شراب پی لی — تھی آگ مثالِ آب پی لی
عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف — پانی نہ پیا شراب پی لی
چھوڑے کئی دن گزر گئے تھے — آئی شبِ ماہتاب پی لی

میں نے کلامِ ریاضؔ کے اس طویل تبصرہ میں جہاں دوسرے لکھنے والوں کی جگہ چھین لی ہے اُن کی وہ خوبیاں دکھانے کی بھی کوشش کی ہے جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں، اُن کی وہ نادر ترکیبیں، وہ چلتے ہوئے فقرے، وہ محاکات کا حُسن اور شان اور وہ شراب کے موضوع پر اُن کی قدرت! میں نے اُن کے کلام کے اُن حصوں کی طرف بھی پڑھنے والوں کو متوجہ کیا ہے جو موجودہ نسل کو پسند نہ آئیں گے، بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جو اُن کے غیر محتاط معترف کو بھی تسکین نہ دیں گی۔ اُن کے دیوان سے بہت سے اشعار نکالے جا سکتے ہیں اور یہ اخراج اُن کی شہرت کے لئے نقصان دہ نہیں بلکہ فائدہ مند ہو گا۔ ان باتوں کے باوجود ایک شخص یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ ریاضؔ اُردو غزل گویوں میں اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔

یہ خاص رنگ ہمیشہ سے تیرا حصہ ہے — ریاضؔ، مانتے ہیں سب تجھے تغزل میں

(ترجمہ انگریزی مقالہ سے) — (پروفیسر) امرناتھ جھا (وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی)

ریاضؔ کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات

خود اُن کے قلم سے

داڑھی کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیان ملک بھی آئے تھے۔ داروغہ عباس علی مرحوم انجنیر و یکتائے فن فوٹوگرافر کے دولت خانہ پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے۔ چند مقتدر نوابین و رؤسائے شہر تشریف فرما تھے۔ منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی کہ ایک رئیس بااختیار مع مختصر اسٹاف کے مرغ زریں بنے آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لئے بہ عجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی شکل مشتین چہرہ غضبناک نہ سلام میں خود سبقت کی نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا صلواتیں۔ لعنت و پھٹکار کی بار بار تکرار اس طرح مقام نشست تک تشریف لائے۔ اور باوصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مگر گفتار اور کردار و لہجے میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون کر سکتا تھا۔ وہ البتہ بتنہائے درشت سے مزاج پرسی فرمائے جاتے تھے کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی تو ایک سن رسیدہ گرم و سرد دیدہ نواب صاحب نے بہ ادب عرض کیا۔ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہم نوا ہونے کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسلامی شہر مگر جسے دیکھئے داڑھی صاف مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں نہ مصافحہ و معانقہ کا موقع نہ سلام علیک کا۔ ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار۔ سلسلہ ٹوٹنے پر مسن نواب صاحب نے عرض کیا۔ برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے خود سبب نہ دریافت فرمایا۔ بہ ادب عرض کرتا ہوں، سنئے :-

غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانان لکھنؤ بھی۔ ریش کے رکھ رکھاؤ میں آپ ہی کے مقلد تھے۔ ایک روز میں خط بنوا رہا تھا۔ آئینے پر نظر تھی۔ اطلاع پر اطلاع مسجدوں، امام باڑوں کے منہدم کئے جانے اور بے احتیاطی برتنے کی آ رہی تھی دفعتاً یہ اطلاع ملی کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اُس کی وسیع و حسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی نہ روک تھام کی طاقت تھی نہ انتقام کی۔ میں نے مشتعل ہو کر خاص تراش سے کہا کہ ریش رکھ کر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبریں سنوں۔ تو اسے صاف کر دے۔ اس کے بعد ہی رئیس صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر "لعنت ہے اس داڑھی پر۔ پھٹکار ہے اس داڑھی پر" جواب میں خاموشی تھی اور سناٹا۔ وہ سین اسوقت تک خیال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ مسن نواب صاحب کے وقتی جواب سے بہتر جواب ایسے کج خلق رئیس کے لئے کیا ہو سکتا تھا۔

ایشیائی شاعری کا اعتراف غازیپور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج اور شاہ امجد اللہ مرحوم منصف کے دولت خانے پر چند معزز حضرات بی۔اے۔ ایم۔اے پاس تشریف فرما تھے۔ ایشیائی شاعری کے متعلق کسی قدر بُرے

پہلو کو لئے ہوئے اظہار خیال ہو رہا تھا۔

میں نے عرض کیا۔ میرانیس مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں امیر مینائی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں۔ شاید وہ اس صحبت میں درجۂ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمہ سے مجھے ممنون فرمائیں۔

اجازت ملنے پر میں نے یہ شعر سنایا ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

میں نہیں کہہ سکتا سننے والوں پر کب تک وجد کی کیفیت طاری رہی۔ ممکن ہے یہ صورت میرے بنانے کے لئے اختیار کی گئی ہو۔ کبھی کبھی شعراء کے قلم سے۔ ایسے شعر نکل جاتے ہیں جو مغربی مذاق سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

تقریباً تیس سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ میرا ایک شعر۔ کسی ولایت کے اخبار میں کسی خاص وجہ سے درج ہوگیا جسے پائنیر نے بھی اور سول اینڈ ملیٹری گزٹ لاہور نے بھی لیا۔ یہ اتفاق ہے کہ سول اینڈ ملیٹری گزٹ کا وہ ترجمہ خان بہادر سید ناصر علی خانصاحب حال پنشنر انسپکٹر نمک مالک صلائے عام دہلی کی نظر سے گزرا۔ ممدوح نے وہ شعر اور اُس کا نوٹ تراش کر مجھے بھیجدیا۔ اور اس کے ساتھ جو الفاظ مجھے لکھے میں اُنھیں مایۂ ناز سمجھا۔ متعدد خطوط بھی انگریزی داں حضرات کے میرے پاس آئے اور خاص الفاظ سے میری عزت افزائی کی گئی۔

بر سبیل تذکرہ وہ شعر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو بھی پسند آئے اور پسند فرمانے میں میرے لئے اخلاقی رعایت سے کام نہ لیا جائے ؎

عالم ہو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

دربار قیصری جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلکدۂ ریاض ماہوار خیر آباد سے شایع ہوتا تھا اور جس کے مطبع کا تاریخی نام لمعۂ درخشاں تھا۔ اعلےٰ حضور جناب نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے اُستاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعے سے یاد فرمایا۔ میں اُسوقت دربار قیصری میں شرکت کے لئے دہلی جانے کو شدت سے بیتاب تھا۔ اس پہلے دربار قیصری میں تمام اخبارنویس ہر صوبے سے مدعو کئے گئے تھے۔ ان کا کمپ خاص تھا۔ خیمے بکمال تزئین و تکلف نصب تھے۔ دو دو اڈیٹروں کے لئے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا، کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ پر تکلف چائے ہر وقت طیار رہتی تھی۔ چمن بندیاں اعلےٰ پیمانہ پر تاحد نظر ہر طرف تھیں۔ میں بھی منشی نظام اللہ مرحوم مالک ریاض الاخبار بھی دہلی گئے۔ کمپ کے سوا۔ مولانا ابوالمنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانے پر بھی مہمان بننا پڑا۔ شب گزاری کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کمپ میں پنجابی اخبار لاہور کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے۔ بعد کو آگئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ مولانائے مرحوم کی طرف سے مہمان نوازی کا بار اُنھیں پر تھا۔

ان تو والیان ملک کے عالیشان پُرفضا فردوسی کمپوں میں گزر تا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہر کمپ میں لہلہاتے ہوئے چمن زار سجے ہوئے بازار ان کی وضع و قطع ان کی آراستگی۔ یہ بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ تمام اڈیٹران اخبار میری ہی

طرح کمپوں کی گلگشت میں رہ کر بقدر مراتب نفع اندوز ہوتے۔ اسی گلگشت میں ظہیر و انور مرحوم سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ مگر ملے صرف دو سو روپیہ حضور نواب صاحب اور تمام درباری فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ خان قلات کے کمپ میں بھی دو ایک اخبار نویس پہونچے۔ امیر قلات نے جب دریافت کیا کہ کون لوگ ہیں تو کہنے والے نے کہا لکھروالا۔ امیر صاحب انکو گورکن سمجھے۔ تنغص پیدا ہوا اور وہ کمپ باہر کردئے گئے۔

مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں جانے کا اتفاق اس بنا پر ہوا تھا کہ مہاراجہ اس سے پیشتر جب رونق افروز لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتارام صاحب تعلقہ دار بسواں، جن کے روابط مہاراجہ سے تھے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے مگر اس وقت مہاراجہ بعزم واپسی سوار ہو رہے تھے سرسری شرف تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف فرمائے دہلی تھے۔ مجھے بھی مہاراجہ کے کمپ میں ہمراہ لے گئے۔ درباری کمپ کے قریب پہونچکر ہم نے دیکھا کہ درباری کمپ سے شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامۂ خیرآبادی کسی قدر متغص آرہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی لجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تنغص کے ساتھ فنس پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ ایڈی کانگ کے خیمے میں چلے آئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سیٹھ صاحب نے استفسار فرمایا۔ کیا واقعہ ہے۔ جواب ملا اس وقت مہاراجہ سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلماء کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا۔ شمس العلما تشریف لائے۔ مہاراجہ نے براہ تعظیم گوشہ مسند پر جگہ دی۔ مزاج پرسی فرمائی ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق مولانا صاحب کو بھی تکلیف دو وہ بھی تشریف لائے، مہاراجہ نے انھیں بھی براہ تعظیم شمس العلماء کے مقابل گوشۂ مسند پر جگہ دی۔ ممکن ہے شمس العلماء کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علما کا کسی مسئلہ پر مناظرہ دیکھوں۔ یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی۔ علماء کی یہ شان نہیں ہے، ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ کو عرق آگیا شمس العلما کے روانہ ہوتے ہی مہاراجہ نے افسر اعلیٰ کو بہ ندامت کچھ ایما فرمایا۔ وہ شمس العلماء کے ہمراہ لجاجت کناں فنس تک آئے۔ شمس العلماء نے کچھ جواب نہیں دیا سوار ہو گئے۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آئے۔ مہاراجہ پر اس ناگوار واقعہ کا زیادہ اثر تھا۔ میں شمس العلماء کی خدمت میں ان کی فرودگاہ پر برابر جایا کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا۔ دوسرے روز مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلیٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار روپئے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا آپ میری طرف سے معذرت اور اظہار افسوس اس وقتی اتفاق پر کیجئے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ کیونکہ میں رئیس رام پور کا ملازم ہوں۔ رئیس کی اجازت و منظوری کی ضرورت ہے۔ افسر اعلیٰ مع خلعت و زرنقد واپس گئے۔ یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولی عہد رام پور کو اپنے کمپ میں گزرا۔ خلد آشیاں بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور تھے۔ پرچہ گزرنے پر خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دیگئی۔ تار ہی پر جواب آیا۔ ہماری طرف سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار دو۔ شمس العلماء جو کسی بات پر مدارالمہام رام پور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کرلیں، اس قدرافزائی پر دربار قیصری کے بعد رام پور چلے آئے اور پھر خلد آشیاں سے کبھی جُدا نہ ہوئے، اول سرسالار جنگ بہادر بھی نابالغ فرمانروائے دکن اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی معیت میں رونق افروز اپنے شاہی کمپ میں تھے۔ وہیں ہم لوگوں کو اڈیٹر صاحب جریدۂ روزگار مدراس اور حیدرآبادی عفو صاحب وغیرہ سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہو گئی۔ شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب ناظر علی خاں بہادر خیرآبادی خویش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہمراہ شرکت دربار

کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ممدوح ہمارے اور نظام اللہ مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے۔ دن میں سوا ناشتے کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ملکہ جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ ۸ بجے شب کو واپسی کی اجازت چاہی مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا۔ پہلے مجھ سے یہ اصرار کیا گیا مگر میں نے معذرت کی جب نظام اللہ مرحوم سے کہا گیا وہ بے تکلف دسترخوان پر نظر آئے۔ میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں اشارے سے کچھ کام لیتا میرے لئے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ۔ سرخ سبز مختلف رنگ کی مدراسی شیرینی بھی تھی نظام اللہ مرحوم نے اس کے لئے بھی اشارہ کیا۔ قہر گرسنہ برجان گرسنہ دسترخوان ختم ہوا تو خواب گاہ کے اندر میزوں کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی بزرگ ممدوح نے فرمایا شہر بہت دور ہے رات زیادہ گئی ہے واپس نہیں جا سکتے۔ میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نظام اللہ مرحوم نے منظور کر لیا۔ خوابگاہ میں سامان استراحت ہو گیا۔ سب حضرات آرام فرمانے لگے۔ میں گرسنگی کی شدت میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند کا کیا ذکر۔ روشنی کم کر دی گئی تھی۔ مجھے کچھ سہارا تھا تو رنگین شیرینی کی طشتری کا۔ جب ہر طرف سے نفیر خواب بلند ہوئی میں اُٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہونچ کر ہاتھ بڑھایا۔ ڈلی کا محسوس ہونا تھا کہ وہ منھ کے اندر پہونچ گئی میں چاہتا یہ تھا زبان پر پہونچنے سے پہلے حلق میں اُتر جائے مگر وہ کمبخت سانپ کے منھ کی چھچھوندر بن گئی۔ نہ اُگلنے کی نہ نگلنے کی۔ رقیق شے ہوتی تو آپ تلخ کا دھوکا کھاتے۔ یہ رنگین شیرینی کی ڈلی نہ تھی۔ صابن کی بٹی تھی۔ میری مصیبت کا لور السلف اُٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لئے۔ صابن کی ٹکیہ منھ میں رکھ کر کام و دہن کو ممنون کیجئے۔ رومال سے صاف ہو کر وہ چیز وہیں گئی، جہاں سے اُٹھائی گئی تھی۔ پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا رومال کی کارفرمائی منھ کے اندر بھی رہی۔ ہم اس آسانی سے پلنگ تک نہ پہونچ سکے۔ جس طرح وہ چیز منھ تک پہونچی تھی۔ اب صابن اپنی جگہ پر تھا۔ مگر اس کی لذت زبان پر۔ سب حضرات پابند نماز تھے، نماز فجر ادا کی۔ ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ سامنے آگئی۔ میں نے دو چار گھونٹ پی کر بسکٹ اُٹھا کر اتنے زیادہ پیالی میں ڈالے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہو گئی۔ دوسری پیالی بڑھا کر کہا اب بسکٹ اس میں ڈالے جائیں۔ نظام اللہ مرحوم کو ہنسی آگئی جو معنی خیز تھی۔ استفسار پر اُنھوں نے کہا آپ تمام دن بھوکے رہے تھے۔ پھر بھی شب کو کھانے میں تکلف کیا۔ واپسی کا بھی سہلا ٹوٹا۔ چائے میں تکلف رخصت ہو گیا۔ آپ بسکٹ سے زیادہ بے تکلف ہو گئے۔ میں دل میں خوش تھا کہ خدا نے صابن کے واقعہ کا پردہ رکھ لیا۔

نیاز صاحب یہ اُسی کا اثر تھا آپ نے جب کہا آپ کے ساتھ کھانے میں اس طرح شریک ہو گیا جس طرح کسی کافر کے ساتھ پینے میں۔ خدا کرے یہ کہنے کا کہیں جلد موقع ملے ؎

اے میں قربان مرا عہد عہد شباب آتا ہے ۔۔۔ یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے

کیا صابن کا واقعہ۔ صحیح مذاق شعری رکھتے ہوئے آپ کے لئے اچھے شعر سے کم ہے۔ اب میں دربار دہلی کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ اسکے لئے بوستان خیال کی ضخامت درکار ہے۔ کمبخت کی یاد یاد جوانی سے کم نہیں۔ یہی کہتے ہوئے وہاں رہے اور یہی کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎ ریاض

دہلی ہے اور ہم ہیں بتان فرنگ ہیں ۔۔۔ دربار قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں

رام پور کی صحبتیں

میں دہلی سے آگرہ آیا۔ میرے والد ماجد مولوی سید طفیل احمد کوتوال آگرہ تھے دو چار روز ٹھہر کر براہ مراد آباد رام پور پہونچا۔ اُستاد مرحوم نے سرکاری مہمان نہ بننے دیا۔ اپنے یہاں ٹھہرایا۔ سرکار سے اجازت لے لی تھی۔ دوسرے روز جناب داغ۔ جناب منیر اور بعض شعرا مجھ سے ملنے آئے۔ میں بھی سب حضرات کی خدمت میں تا قیام حاضر ہوتا رہا۔ وہ سب حضرات بھی تشریف لاتے رہے۔ جان صاحب مشہور ریختی گو دو بار روزانہ آتے تھے ۔ یہی زمانہ تھا کہ سرکار کا فارسی دیوان۔ لسان الملک وزیر ایران کی اصلاح سے مزین ہو معزز سفیر ولی کی معرفت رام پور آیا تھا۔ سفیر سرکاری مہمان تھے۔ ہر طرف اصلاح دیوان کا چرچا تھا۔ خلد آشیاں کا شغف خاطر بڑھا ہوا تھا۔ میں بزم دیرینہ نواب آفتاب الدولہ قلق سے جا کر ملا جناب اسیر موجود نہ تھے۔

شعرا علما ر فضلا و دیگر ممتاز حضرات روزانہ دربار میں جاتے دربار کا وقت ایک بجے سے ۴ بجے تک تھا درباری ہال سے ملا ہوا ایک کمرہ اُستاد مرحوم کے لئے عوارض کی وجہ سے مخصوص تھا۔ درباری نشستگاہ سے کچھ دور مصاحب منزل کی عمارت تھی۔ سب حضرات وہاں موجود رہتے سرکار جسے یاد فرماتے چوبدار نام لیکر درباری ہال کے آخری دروازہ سے پکارتا۔ حضور یاد فرماتے ہیں۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔

خلد آشیاں کا شاہی رعب ہر ہستی پر بہت زیادہ اثر انداز تھا البتہ شمس العلماء مولانا عبدالحق علامہ خیر آبادی اس سے مستثنےٰ تھے میں بھی مصاحب منزل میں وقت سے کچھ پہلے حاضر ہوا۔ جناب داغ جناب منیر علامہ خیر آبادی نیز دو چار صاحب اور تشریف فرما تھے۔ آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ مصافحہ و معانقہ و مزاج پرسی کے بعد جناب داغ نے بہ اصرار کچھ سنانے کے لئے مجھ سے ایما فرمایا۔ بہ تعمیل ارشاد میں نے یہ مطلع پڑھا

؎ ہنگام نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

تحسین و آفرین کی آواز ہر طرف سے ہمت افزائی کے لئے آئی۔ اسی طرح ہر شعر کی داد مجھے ملی۔ میں نہیں کہہ سکتا، تقاضائے اخلاق و مہمان نوازی تھا یا واقعی اشعار ایسے مستحق تھے اس زمین میں ایک شعر ایسا تھا جو بعض حضرات کو یاد رہ گیا۔ میں وہ شعر بھی آپکے ملاحظے کو یہاں درج کئے دیتا ہوں

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

اب یاد فرمائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آواز آئی۔ مولانا عبدالحق صاحب کو حضور یاد فرماتے ہیں۔ اسی طرح منیر و داغ و دیگر حضرات تشریف لے گئے۔ تیس بتیس کے بعد میرا نمبر آیا۔ خسخانے میں بیرونی روشنی سے آتے گونہ تکلف ہوتا تھا۔ میں اس دروازہ پر پہونچا نگہ روبرو کی صدا بلند ہوئی آواز کے ساتھ ہی مجھے سلام کے لئے جھکنا پڑا۔ درباری سب آداب اُستاد مرحوم سے دریافت کر کے نقش دل کر چکا تھا۔ سرکار کی نشست تقریباً وسط ہال میں مسہری پر تکیوں کے سہارے تھے۔ ایک صف مسہری کے روبرو جنوب میں اُستاد مرحوم سے شروع ہو کر کسی اور پر ختم ہوئی ہو دونوں صفوں کے مابین کچھ جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ جس سے نگہ روبرو کی منزل طے کر کے مجھے نذر دینے مسہری کی طرف بکمال ادب دست بستہ نیچی نظر کئے۔ خسخانہ کی خوش گوار کم روشنی میں سنگ مرمر کی خنک فرش پر سے گزرنا پڑا۔ نذر پیش کی قبول ہوئی۔ واپسی میں بھی رخ خلد آشیاں کی طرف تھا۔ خدا نے بخیر و خوبی منیر کے برابر نشست کی مشکل آسان کی زانو شکستہ دست بستہ نیچی نگہ کئے بیٹھ گیا۔ سرکار نے فرمایا ریاض تم نے آنے میں بہت دیر کی معذرت کے الفاظ ختم ہونے پر داغ سے فرمایا۔ ہمارا کچھ کلام ریاض کو سناؤ۔ جناب داغ نے اپنے قامت سے زیادہ کشیدہ و بلند آواز سے اپنے مخصوص انداز میں سرکار کے اشعار سنائے۔ کبھی حضور خود قافیہ و ردیف اور کسی غزل کا مصرع داغ صاحب کو بتا دیتے۔ جس طرز خاص سے اشعار کی داد دیجاتی تھی۔ اس نے حضور کو اس قدر لطف اندوز کیا کہ خود حضور اپنے شعر سنانے لگے۔ دیر تک یہ رنگ قایم رہنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ ریاض تم کو فارسی کا بھی شوق ہے۔ سنتے ہی روح مائل پرواز نظر آئی اس لئے کہ اصلاحی دیوان فارسی دیکھنے کا اُستاد مرحوم نے کچھ موقع اپنے دولت خانے پر دیدیا تھا۔ جس میں بہ کثرت عربی فارسی کے لغت۔ بندشیں خاص۔ بلند مطالب کے سوا زبان بدلی ہوئی۔ مجھے جواباً عرض کرنا پڑا۔ حضور کے فارسی کلام کا بہت مشتاق ہوں۔ حضور نے اُستاد مرحوم سے بہ اظہار قافیہ مخصوص قصیدہ سنانے کی فرمایش کی۔ چوبدار دیوان لایا۔ اُستاد مرحوم نے اپنے خاص انداز میں بلند آواز سے مطلع پڑھا۔ مجھے اتنا موقع مل گیا تھا کہ منیر مرحوم سے اشارہ کر سکوں۔ روشن ضمیر منیر یقیناً میرا مفہوم سمجھ گئے۔ آپ نے اس وضاحت سے لفظ لفظ کی تعریف کی کہ مجھے منیر کے ساتھ ہمنوا رہنے میں زیادہ دقت نہیں پیش آئی۔ قصیدہ ختم ہونے پر زیادہ وقت گزر جانے سے۔ یکے بعد دیگرے حضرات رخصت ہونے لگے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں اپنی قیام گاہ تک پہونچ گیا۔ درباری نشست۔ جس کا اتفاق پھر بھی ہونے والا تھا۔ ایسی نہ تھی کہ میں اسے بھول سکوں۔ میں جاتے ہی بیمار ہو گیا اور مصنوعی صحت بھی قایم نہ رکھ سکا۔

دوسرے روز اُستاد مرحوم نے دربار سے واپس آنے پر سرکار کی ایک غزل تضمین عطا فرمائی اور بہ ایمائے سرکار اسی طرح میں غزل

کہنے کے لئے ارشاد فرمایا - بیماری نے حاضری دربار سے مطمئن کر کے مجھے فکر کا اچھا موقع دیدیا - غزل بھی کہی مصرعے بھی لگائے۔

—————— میں تو عذر بیماری سے سرکار میں جا نہ سکا - اُستاد مرحوم نے تضمین بھی پیش کی اور غزل بھی - وقت حضوری سرکار نے مجھ سے ارشاد کیا اگر مشق سخن رہی تو مجھ سے گوئے سبقت لے جاؤ گے۔

اشعار مندرجۂ ذیل حاضرین کو بھی سنائے گئے - منیر و داغ نے بھی مجھ سے تعریف کی یہ دونوں شعر لوگوں کو یاد بھی ہو گئے - خصوصاً دوسرا شعر وہ شعر یہ ہیں ؎

جس کا تمام خلق نے رکھا ہے خضر نام | بھٹکا ہوا یہ کوئی مرا نامہ بر نہ ہو

باہم شبِ وصال اُٹھائے ہیں کیا مزے | وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

خُلد آشیاں نے چاہا - میں رام پور سے واپس نہ جاؤں - ماہوار بھی تجویز فرما دی - اُستاد مرحوم نے مجھ سے مشورہ فرما کر اخبار و پریس کی وجہ سے فوراً تعمیل ارشاد میں میری طرف سے اظہار معذرت اور چند روز کے بعد وعدۂ حاضری کا اظہار فرمایا - جس روز میں رخصتی سلام کو جانے والا تھا - اس سے ایک دن پیشتر اُستاد مرحوم نے افسردگی کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ شمس العلما اور داغ صاحب نے ذکر آنے پر سرکار سے عرض کیا کہ دیوان ناظم کی مطبوعہ جلدیں بہ احتیاط کتب خانے میں مدت دراز سے رکھی ہوئی ہیں اگر ریاض کو مرحمت فرمائی جاویں تو پریس و اخبار کی وجہ سے وہ بہت کافی طور پر نفع اندوز ہو سکیں گے - سرکار نے بھی یہ تجویز پسند فرمائی - میں نے اُستاد مرحوم سے عرض کیا کہ خیرآباد ایسا مقام ہے جہاں کاغذ بھی آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتا - اُستاد مرحوم نے فرمایا آپ ہی سرکار میں وقت رخصت عرض کریں - میں خود کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا

میں نہایت افسردگی کے ساتھ دوسرے دن - سلام رخصت کی غرض سے حاضر دربار ہوا سرکار نے بہ لطف خاص ارشاد فرمایا کہ ریاست کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھو اور حسب وعدہ تا امکان بے نظیر کے میلے سے کچھ قبل آجاؤ - میں نے عزت افزائی پر دلی شکریہ ادا کیا - کچھ غدر کا ذکر اور ریاست کی خدمات بیان فرمائے - ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ ریاض الاخبار میں اس کا ذکر نہ آنے پائے - آخر میں حسب ایما چوبدار ایک کشتی حضور کے روبرو لایا - مجھے بھی قریب جانا پڑا - حضور نے خلعتی دوشالہ اپنے دست مبارک سے میرے زیب دوش کیا - مقررہ آداب دربار کے موافق بہ ادب سلام کر کے جب مکان کو روانہ ہوا تو بے ساختہ یہ شعر موزوں ہو گیا ؎

ریاض اس درجہ وہ نواب کی بخشش پہ عاشق تھی | لپٹ کر رہ گئی تقدیر خلعت کے دوشالے میں

اُستاد مرحوم دربار میں آج تشریف نہیں لے گئے تھے - منتظر تھے کہ کاغذ خیرآباد میں نہ فروخت ہونے کی معذرت کا کیا نتیجہ ہوا - اُستاد مرحوم سے زیادہ جناب مفتی طالب حسین صاحب برادر معظم امیر مینائی مرحوم جو غالباً اسوقت مفتی عدالت تھے اور جامع کمالات بھی میرے نتیجۂ رخصت کے منتظر تھے - میری واپسی - خلعت دوشالہ عطا ہونے سے بہت خوش ہوئے یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ گیارہ چوبدار وردی پوش مع جمعدار کے کشتیاں سر بندلئے ہوئے آئے - جمعدار نے اُستاد مرحوم سے عرض کیا - سرکار نے ریاض صاحب کے لئے یہ کشتیاں بھیجی ہیں - ہر کشتی میں دس یا پندرہ جلدیں دیوان ناظم کی تھیں اور ایک کشتی میں پارچہ اور دو سو روپیہ - نقد کے ساتھ - کسی چیز کے لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا - اُستاد مرحوم مع موجودین بہت خوش ہوئے - چوبداروں کو اُستاد مرحوم نے زر انعام دیکر رخصت کیا اور مجھے زردار بنا کر -

میں یہ ظاہر کر چکا ہوں کہ دیوان ناظم کی - کئی سے جلدیں جو خلد آشیاں نے مجھے مرحمت فرمائیں وہ شمس العلماء اور جناب داغ کی تحریک و تائید کا نتیجہ تھیں - ممکن ہے مجھے زیادہ فایدہ پہونچنے کے خیال سے یہ تحریک پیش کی گئی ہو - بذہن خود میں سمجھتا تھا کہ شمس العلماء مجھ سے گونہ کشیدہ ہیں - داغ صاحب کو بہ اعتبار مراسم تائید کے سوا چارہ نہ تھا -

مولانا عبدالحق خیرآبادی - داغ اور ریاض —— شمس العلماء کی کشیدگی کا خیال مجھے اس بنا پر تھا کہ شمس العلماء کے

عم بزرگ جناب مولوی مظفر حسین صاحب شوخ جو ترک وطن کر کے اجمیر شریف میں آستانۂ مبارک پر ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو چکے تھے۔ انکی دختر نیک اختر کی نسبت قبلہ حافظ عنایت احمد مرحوم خیرآبادی مشہور وکیل دہلی کے ساتھ ان کی زوجہ مرحومہ نے کئی سال ہوئے کر دی تھی شمس العلما نے بحالت لاعلمی اپنے عم بزرگ سے فوری منظوری کی اپنے عقد کے لئے تحریک اُن کے صاحبزادی کے ساتھ کی۔ یہ تحریک منظور ہو کر عقد رومال پر یا کسی خاص مسئلے کے تحت میں بمقام اجمیر ہو گیا۔

لڑکی ماں کے پاس۔ خیرآباد یا رسولی ضلع بارہ بنکی میں مدت مدید سے تھی۔ ماں کو جب عقد صبیہ کا حال معلوم ہوا تو وہ خاندانی مراسم کی بنا پر فوراً فرنگی محل چلی گئیں۔ وہیں سے حافظ عنایت اللہ مرحوم وکیل دہلی کو طلب کیا اور خیرآباد سے دیگر اعزہ کو۔ یہاں سے مجھے اور حافظ نظام اللہ مرحوم کو منشی نیاز احمد نے بھیجا — ہم دونوں بھی بمقام فرنگی محل اسی مکان میں ٹھہرے۔ جہاں بزم عروسی برپا تھی دوسرے روز شب کو مراسم عقد عمل میں آئے۔ مولانا عبدالرزاق قدس سرہ العزیز فرنگی محل نے نکاح پڑھایا۔ مبارک سلامت کے ساتھ وقت گزر گیا شمس العلما بھی کسی ذریعہ سے خبر پاتے ہی لکھنؤ آئے اور سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ ناکح اور گواہ وغیرہ بھی شوہر کے ساتھ مدعا علیہم قرار پائے۔ سمن جاری ہوئے۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ ہر طرف یہی شور، یہی چرچا۔ علما و عمائد لکھنؤ سب آتش زیر پا۔ مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی اس پائے بزرگ کہ لکھنؤ کے سوا بیرونجات میں بھی شدید اثر تھا۔ دقت یہ تھی کہ شمس العلما کا درجہ بھی بلاد ہند اور دیگر ممالک میں مسلمہ تھا۔

اُس زمانہ میں مولوی یعقوب صاحب فرنگی محلی کی ادارت وملکیت میں لکھنؤ سے ہفتہ وار کارنامہ شایع ہوتا تھا۔ جس میں اس مقدمہ کے متعلق کچھ مضامین شایع ہوئے جن کی سرخی تھی "دو ملا میں مرغی حرام" صلح کی تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں۔ تاریخ پر عدالت میں ہجوم تھا۔ مدعا علیہم کی جانب سے جماعت وکلا نے ایک محضر پیش کیا۔ جس پر تمام علما نے حوالجات کتب کے ساتھ عقد کے ناجائز اور غیر صحیح ہونے پر دستخط کئے تھے۔ وکلا نے زور دیا کہ استغاثہ خارج کیا جائے — شمس العلما نے بجواب عدالت کے روبرو مختصر دلنشین تقریر کی اور عدالت کو یہ سمجھا دیا کہ جن علما نے محضر میں استغاثے کے خلاف حوالے دئے ہیں۔ میں ان سے دو چار مختصر سوال کروں گا۔ عدالت جوابات کے ساتھ انھیں قلمبند کر کے فیصلہ فرما دے۔ مگر اتفاق کہ صرف محضر پر بہ امید آیندہ تاریخ اکتفا کی گئی تھی۔ کوئی حاضر نہ ہوا تھا۔ وکلا نے اسکے خلاف عدالت سے چاہا کہ علما کو حاضری کی تکلیف نہ دیجائے مگر عذرات نامسموع ہو کر قطعی تاریخ بہ اجرائے سمن مقرر کر دی گئی (عدالت علما کی بحث کے لطف کو کب ہاتھ سے جانے دیتی تھی) - بلند پایہ علما عدالت میں جانا نہیں چاہتے تھے۔ خصوصاً مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی جن کا عدالت میں جانا لکھنؤ کیا ہندوستان گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس تاریخ کی شہرت تمام لکھنؤ میں بلکہ دور دور اضلاع غیر و بیرونجات میں ہو گئی تھی۔ ہر شخص تاریخ پر عدالت میں وہ سماں دیکھنا چاہتا تھا جو پورب کے گنوار پچاس برس پہلے ہائی کورٹ الہ آباد کی شاندار عمارت وکلا و بیرسٹروں وغیرہ کے کر و فر سے مرعوب و متاثر ہو کر دیہات کے گنواروں میں داد خوش بیانی دیا کرتے تھے۔ مثلاً شاندار ملبوس کے ذکر میں "اُدھر سے آئے ہمار ڈبلو سر پر باندھے کنات" (قنات کنایہ از دستار) ڈبلو (وکیل) پھر عدالت کے روبرو انکی گرج اور کڑک۔ جو مشتاق آہا گانے والوں کو نصیب نہیں مثلاً اس کا یہ آخری فقرہ :- پھاٹے لاگ چرّی چوُے لاگ انگار ٹپ - ٹپ - ٹپ

(بجلی) (ٹپکنے لگے

الفاظ کا گھٹاؤ و بڑھاؤ اور موقع سے ٹھہراؤ جس موثر انداز میں عظمت وجلال اور شان وشوکت پیدا کرتا تھا۔ اس کا بیان دشوار ہے۔

اس مقدمہ کی وجہ سے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت کو ہائی کورٹ اور چیف کورٹ کا درجہ حاصل ہونے والا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ ایک طرف

نہ صرف علمائے فرنگی محل بلکہ تمام علمائے فرنگی بلکہ تمام علمائے لکھنؤ۔ پھر دہلی و لکھنؤ کے وکلاء کی ایک اثر انداز جماعت اُنکے علاوہ۔ دوسری طرف شمس العلماء خیر آبادی جو اور علوم کے علاوہ منطق میں خود اپنی نظیر ہو سکتے تھے۔ ذہانت۔ وکاوت۔ حافظہ۔ ہر بات خداداد۔ خوش بیانی کا وہ عالم کہ سننے والا محو و سہو۔ ان کی تائید میں اور جو حضرات ہوں مجھے علم نہیں۔ معاملہ بھی نازک۔ مسئلہ بھی نازک ؎

وہ بھی نازک اور نازک وقت بھی　　کیا ہو صبح وصل دیکھا چاہئے

شمس العلماء کو کچھ بھی علم ہوتا کہ مولوی حافظ عنایت اللہ وکیل سے لڑکی کئی سال سے منسوب ہے۔ تو باوصف اس کے کہ شمس العلماء کی اہلیہ کا انتقال ہو جانے سے عقد کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کبھی ادھر ملتفت نہ ہوتے۔ اسی طرح اہلیہ مولوی مظفر حسین کو اس کا علم ہوتا کہ شمس العلماء کا عقد صحیح و جایز طور پر ہو چکا ہے تو وہ دختر نیک اختر کے عقد میں عجلت سے کام نہ لیتیں۔ اب فریقین کے لئے سنگ آمد و سخت آمد کا معاملہ تھا۔ سٹی مجسٹریٹ کی عدالت تاریخ پر تھیٹر اور سینما کی اسٹیج بننے والی تھی۔

علمائے فرنگی محل و عمائد شہر کی طرف سے چند با اثر مقتدر اکابر خاص شقے اور متعدد گرامی نامے لیکر رامپور پہونچے اور نواب کلب علیخاں بہادر مرحوم کے حضور میں باریاب ہوئے۔ باوصف اسکے کہ خلد آشیاں اپنے اُستاد کے مرتبے اور نازک مزاجی کا بہت ہی لحاظ رکھتے تھے مگر وعدہ فرما کر سب کو مطمئن کر دیا۔ اور شمس العلماء علامہ خیر آبادی کو بہ عجلت تمام خاص طریقے سے طلب فرما کر اپنی آرزو برآری کا وعدہ لیا پھر ارشاد فرمایا کہ رفیق زندگی جن شرائط کے ساتھ مطلوب ہو اس کا انتظام و اہتمام ریاست کے ذمہ ہے۔ تمام کارروائی صیغۂ راز میں رہی۔ اور تاریخ پر صلحنامہ یا استغاثے سے دست برداری عدالت میں داخل ہو گئی۔

حوریاں رقص کناں ساغر مستانہ زدند

یہ اسباب تھے جن کی بنا پر میں شمس العلماء کی نسبت غلط فہمی میں مبتلا ہوا مجھے تسلیم ہے کہ شمس العلماء کی تحریک اور جناب داغ کی تائید نیک نیتی سے تھی۔ گر مجھے بہ اعتبار تعداد زر نقصان پہونچا اور گو خلد آشیاں نے اپنے دست مبارک سے خلعتی دوشالہ میرے زیب دوش فرما کر مجھے گراں دوش کیا اور زر نقد بھی شاندار طریقے سے بھیجا۔ مگر میں "بر دکتا بے چند" کا ہر طرح مصداق رہا۔

شاہ دکن، داغ اور ریاض

کارنامۂ لکھنؤ نے جس عنوان کے تحت میں مضامین شایع کئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ اڈیٹر ریاض الاخبار وگلکدہ ریاض کا اُن سے لگاؤ نہ ہو۔ صرف بزم عقد لکھنؤ میں میری شرکت کم و بیش آزردگی کے لئے کافی سمجھی جا سکتی تھی۔ بہر حال انچہ گزشت گزشت۔ یہ صحیح ہے کہ شمس العلماء اور جناب داغ کے تعلقات تاحیات مجھ سے کمال شگفتہ رہے اور دونوں مقتدر ہستیاں مجھے ہمیشہ اک شاگرد عزیز کا ہم مرتبہ سمجھتی رہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ جب شمس العلماء حیدر آباد دکن سے وظیفہ یاب ہو کر خیر آباد واپس آئے تھے تو میری زبان سے بر سبیل تذکرہ ایک واقعہ سُن کر دیر تک کف افسوس ملتے رہے اور بار بار یہ فرماتے تھے کہ داغ صاحب سے یہ غلطی کیونکر سرزد ہوئی۔

واقعہ یہ تھا کہ گلچیں جب لکھنؤ سے گورکھپور منتقل ہوا۔ اس کا تعلق مجھ سے اور ریاض الاخبار پریس سے ہو گیا۔ میں نے یہ التزام کیا کہ مصرع طرح ہر مرتبہ کسی اُستاد سے یا ایسے ممتاز شعراء سے لیا جائے جو قیع ہوں اس التزام سے کئی نمبر گلچیں کے بہت کامیاب نکل چکے تھے اسی سلسلے میں اُستاد مرحوم کو تکلیف دی گئی اور جناب امیر مینائی نے یہ مصرع لطف فرمایا:

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

جب یہ مصرع شایع کیا گیا تو گلچیں میں مصرع طرح پر مصرع بہم پہونچانے کی بھی فرمایش کی گئی۔ ابھی اس طرح میں ناتمام دو تین نمبر

نکلے تھے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم خسرو دکن بالقابہ کو توجہ اس طرف ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کی غزل کا یہ مصرع اس قدر مقبول و شہرت پذیر ہوا کہ تمام ہندوستان پر چھا گیا اور گویا وہی مصرع طرح قرار پا گیا۔

یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

متعدد شعرائے نامی نے اس پر مصرعے لگائے۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس زمین میں پوری قوت سے فکر نہ کی ہو۔ گلچیں کے نمبر ایک سال تک اسی طرح میں نکلتے رہے۔

جب خسرو دکن نے غزل کہی اور اس مصرع ہر طرف دور دور شہرت حاصل کی۔ تو دکن سے ابراہیم صاحب خانساماں کا خط ان کے پیش دست کا لکھا ہوا میرے نام آیا جس میں تحریر تھا میں تمھارے لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دوں گا تم یہاں آنے کے لئے تیار رہو۔ بہت جلد اعلیٰ حضرت تمھیں یاد فرمائیں گے اور تین مصرع طرح گلچیں کے لئے اعلیٰ حضرت نے مرحمت فرمائے ہیں۔ ان کو نمبروار شایع کرتے رہنا۔

مجھے سطحی تحریر اور تم تم کی تکرار خط میں گراں گزری۔ میں ابراہیم صاحب خانساماں سے واقف نہ تھا نہ اُن کے پیش دست سے۔ میں نے جناب داغ کو نیاز نامہ بھیجا اور اسی کے ساتھ ابراہیم صاحب کے خط کی نقل بھیجکر اعلیٰ حضرت کے عطیہ طرحی مصرعوں کی اشاعت کے لئے ممدوح کی رائے دریافت کی۔

ممدوح نے تحریر فرمایا۔ جواباً لکھ دیجئے۔ جب تک اُستاد اعلیٰ حضرت کی وساطت سے مصرعے نہ آئیں گے، گلچیں اشاعت سے قاصر رہے گا۔

اس کا اثر جو کچھ ہونا چاہئے تھا ظاہر ہے۔

شمس العلماء دست افسوس ملکر اس واقعہ کو جناب داغ کی غلطی اور میری انتہائی بدنصیبی پر محمول کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ابراہیم صاحب کے اقتدار و اختیارات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر فرماتے۔ میں دل ہی دل میں کہتا ؎

چشم ما بسیار ازیں خواب پریشاں دیدہ است

جناب شمس العلماء کی سابقہ نوازشوں اور اس برتاؤ سے میں کبھی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ شمس العلماء کی طبع نازک پر میرے کسی فعل سے گرانی پیدا ہوئی ہو۔ بفرض ایسا ہوا بھی ہو تو وقتی چند ساعت کے لئے خفیف اثر ممکن ہے اسی طرح جناب داغ کی نسبت میں شمس العلماء کا ہم خیال بنکر ان کی غلطی بھی اپنے متعلق کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جناب داغ تا حیات نہایت کشادہ دلی سے ریاض الاخبار کے پردہ میں میری امداد فرمانا اپنی وضع میں داخل سمجھتے تھے۔ ممدوح کے ہر نوازش نامے میں حرف حرف سے محبت ٹپکتی تھی۔ بلکہ سادہ بین السطور سے بھی محبت کے چشمے اُبلتے تھے۔

گلچیں و گلکدہ میں ماہ صوم میں آفتاب لب بام بن کر اپنے مراسلہ میں رخصت ہوا تھا۔ اب بھی وہیں ہوں۔ جہاں تھا اور نہ معلوم اپنی جگہ پر ابھی کب تک رہوں۔ زوال پذیر ماہ کامل بننے کو بھی اس لئے جی چاہتا ہے کہ ؎ داغ

ہوتا ہے حسینوں کا یہی وقت نمائش ورنہ مہ کامل نہ سر شام نکلتا

مگر ماہ کامل اس آرزو میں صرف داغ۔ اپنی تابانی سے بن سکتے تھے کہ دور ہی سے نظارہ ہو۔ وہ آسمان پر۔ حُسن جہاں افروز زمین پر

مجھے زمین و آسمان کا بُعد محض نظارے کے لئے پسند نہیں جس کی جوانی اس طرح گزری ہو ؎

کوئی نہ کوئی ہے جلوہ گستر ریاضؔ معشوق ماہ پیکر ۔۔۔ کہ شام آئی ہے جو مرے گھر وہ چاندلائی ہے چودھویں کا

بڑھاپے میں ایسے شخص کا لب بام رہنا ہی اچھا۔ جب تک رہے۔ چل چلاؤ کا نازک وقت۔ بہت ہی عزیز ہوتا ہے۔ زندگی سے اُکتانے والے اور ہوں گے میں تو چاہتا ہوں۔ کتنے ہلال بدر ہوتے۔ کتنے بدر کاہیدہ ہوتے برسوں دیکھوں۔ خدا نے چاہا تو بتوں کے جلوے ہمیشہ اُسکی یاد میں پیش پا اُفتادہ رہیں گے اور رشک سے مجھ پر ہلالِ عید کی طرح اُنگلیاں اُٹھیں گی ؎ محمد عمر

اُنگلیاں اُٹھتی ہیں مجھ پر میں جدھر جاتا ہوں ۔۔۔ عید کا چاند ہوا چاک گریباں ہونا

نگار نے تصویر سے روشناس خلق کرنا چاہا۔ تو میں کیوں نہ کہوں ؎ غالبؔ

وہ اک ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر ۔۔۔ نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

جینے کو میری طرح خضر علیہ السلام کا بھی جی چاہتا تھا۔ عمر جاوداں کے لئے چور ہی بن کر سہی۔ درازیٔ عمر نے ریش سفید کے ساتھ مجھے بھی خضر صورت تو بنا دیا ہے۔ میں کم سے کم یہ ضرور چاہتا ہوں کہ خضر سے مستفید نہ ہوں نہ سہی ان کی کسی طولانی حصۂ عمر سے فایدہ اُٹھاؤں۔ کیا حضرت خضر سے میں طنزاً کہہ سکتا ہوں ؎ ریاضؔ

ملی بھی خضر تو یہ تم سے نیک بندے کو ۔۔۔ گناہگار نہ تھے عمر جاوداں کے لئے

عمر جاوداں کے لئے لذت معاصی کے اعتبار سے حق تو میرا ہی تھا۔ معصوم کے لئے تو عمر جاوداں ہمیشہ بظاہر بے لذت رہے گی۔ اُن کے لئے خدا کی دین ہے تو مجھ گنہگار سے خدا کی دین کو کیوں تکلف جو اس کے شکر میں معصیت سے زیادہ لذت پاتا ہے وہ چاہے تو اپنی رحمت سے مجھ آفتاب لب بام کے لئے ہر منٹ خضر کی عمر جاوداں بن سکتا ہے میں خیرآباد چاند کی کاہیدگی لئے ہوئے آیا۔ چار دن نہیں گزرے تھے کہ ہلال عید یہاں ۲۹ کو نظر آگیا۔ یہاں کے سوا ہر جگہ ۳۰ کا چاند ہوا۔ ماہِ صوم بھی گزرا عید بھی ہو چکی اب مجھے یہ کہنے کا جلد موقع ملے گا۔ ع

برما بگزشت وایں دل زار ہنوز

خدا نے چاہا تو مصرع کا دوسرا ٹکڑا بار بار دُہرانے کی نوبت آتی رہے گی۔ پچھلے مصرع کا پہلا ٹکڑا یعنی برما بگزشت بھی بشرط زندگی گوارا کرلوں گا۔ ع ۔۔۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

گلچیں کے چھوٹے ہوئے ذکر کے سلسلے میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ اعلےٰ حضرت جنت نصیب میر محبوب علی خاں تاجدار دکن کا مصرع۔ طرح کا مصرع نہ تھا۔ مگر متعدد شعراء کے مصرع لگانے اور ہر طرف شہرت ہو جانے سے اس کی مقبولیت مصرع طرح سے کہیں زیادہ رہی ایک تضمینی مصرع اعلےٰ حضرت کے مصرع پر گو وہ کسی درجہ کا ہو یاد آگیا جو لکھے دیتا ہوں۔ استفہامیہ طرز سے پڑھنے کی ضرورت ہے ؎

جو لو کروٹ تو میں سمجھوں شب ہجر ۔۔۔ یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

مگر اصل مصرع طرح کی تضمین یعنی ع "کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے" باوصف توجہ دلانے کے کسی بلند پایہ شاعر سے بھی ہو سکی عام شعراء کے لئے ایک ہی پیش پا اُفتادہ مضمون کے سوا۔ کوئی صورت نہ تھی اور اس کے لئے توارد ہونا بھی لازمی تھا ؎

گل سوسن پہ شبنم کب پڑی ہے ۔۔۔ کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

بلند پایہ شعراء نے ضرور توجہ کی ہو گی مگر نہ کہہ سکے۔ صرف امیر مینائی نے مصرع لگایا۔ جسے دیکھ کر ہمیشہ کے لئے قوت شعری گویا عاجز ہو گئی۔ اب بھی مصرعہ نہیں ہو سکتا۔ امیر مینائی فرماتے ہیں ؎

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

گلدستوں میں پیام یار و گلچیں نے زیادہ عمر پائی - نکلے - اچھے اچھے پرچے - خورشید صاحب کا پرچہ بھی فصیح الملک بھی (جس کا نام غالباً پہلے گلزار خلیل تھا) قنوج کا پرچہ بھی - جس کے مہتمم بھگو خاں تھے اور با وصف اعتبار ہی نام کے - مانگتے تھے ہمیشہ پیشگی - سب سے اچھا دامن گلچیں تھا - جس کے چند پرچے نکلے - مگر ہمیشہ کے لئے یادگار اُسکے بند ہوتے ہی - مرحوم آقائے سخن وسیم نے یہ کہکر ع

گلچیں بہار تو ز دامانِ گلہ دارد،

گلچیں نکال دیا - اولیت میں مقبولیت کے ساتھ صرف گلکدۂ ریاض کے سر رہا - ساتھ ہی "غالباً" کہدوں تو مضائقہ نہیں - مولانا حسرت موہانی نے اُردوئے معلےٰ نمبر ۱۰ جلد ۱۲ - اکتوبر نمبر میں "گلکدۂ ریاض خیر آباد نمبر ۲" عنوان میں لکھا ہے - اس سے پہلے ایک مضمون شوق نیموی مرحوم کے متعلق ہے ساتھ ہی اُن کے - اصلاح نام پرچے کا بھی ذکر ہے - بہر حال اصلاح ہو یا کوئی اور پرچہ شرف اولیت گلکدۂ ریاض کو ہے اور پرچے جن کا ذکر ہوا بہت بعد کے ہیں - فتنوں پر فتنہ گروں پر ترجیح اسے فرضی قیامت کو ہے ؎ ریاض

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے وہ تم سے قد میں کم - سن میں بڑی ہے

گلکدۂ ریاض کی خاص خوبی یہ تھی کہ اُس میں حتی الامکان سب شعر منتخب درج کئے جاتے تھے اور اس اُصول کی پابندی اس سختی سے کیجاتی تھی کہ بعض پرچوں میں اسیر سے اُستاد کامل کی غزل کا صرف ایک ہی شعر چھپا ہوا نظر آتا ہے - اس وقت تک نمبر کو حصہ لکھنے کا رواج تھا - مثلاً ۱۸۸۰ء کے اپریل پرچے کو گلکدۂ ریاض حصہ چہارم جلد ۲ لکھتے تھے - منشی امیر احمد کے متفرق اشعار کا مجموعہ سب سے پہلے گوہر انتخاب موسوم آبِ گوہر کے نام سے بطور ضمیمہ اسی گلدستہ میں شایع ہوا - کچھ دنوں میر تقی میر کے کلیات کا انتخاب اسی میں نکلتا رہا - رسالۂ معیار لکھنؤ نے ایک مقررہ قافیے کی تحت میں کلام شعرا کی اشاعت کا جو طریقہ اختیار کیا اسکی ابتدا بھی گلکدۂ ریاض سے ہوئی ہے

دربار رامپور کے شعراء

میں جس زمانہ میں خلد آشیاں کا طلبیدہ رام پور گیا تھا - جناب داغ کا پہلا دیوان گلزار داغ زیر نگرانی امیر مینائی طبع ہو رہا تھا - جلال و تسلیم جب تک لکھنؤ میں تھے - تسلیم سہسوانی و صبا البتہ رام پور میں تشریف رکھتے تھے - لکھنؤ میں تسلیم لکھنوی دانشرف ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ میں رہتے - کتابت میں دونوں ہم بیشہ دونوں نولکشور آنجہانی کی نظر میں وقیع - دونوں کو نسیم دہلوی سے تلمذ - باوضع بھی - خلیق بھی - سراپا عجز بھی کبھی کبھی شمس لکھنوی بھی ان کے ہمراہ نظر آجاتے - مشتری طوائف مشہور شاعرہ ان کی شاگرد تھی - اس کی شاگردی نے شمس کی شہرت کو چار چاند لگادئے تھے - زہرہ ہمشیرۂ مشتری بھی ان کی شاگرد تھی - یہ لوگ واقعی مرتبے کے تھے - صحیح ہو یا غلط مندرجۂ ذیل شعر میں نے شمس کے نام سے سنا تھا:

بھینے نہ دیں گی آنکھیں تری دلربا مجھے ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

نواب آفتاب الدولہ بہادر قلق میرے جانے پر رام پور میں موجود تھے - قیام لکھنؤ کے زمانہ میں بار بار اُن سے ملا تھا گو وہ زمانہ عسرت کا تھا - مگر آن بان پابندی وضع خود داری ان کا حصہ تھی - امیر مینائی کی وساطت سے خلد آشیاں نے آپ کو رامپور طلب فرما لیا تھا - واپس آنے پر کچھ عرصے کے بعد میں نے سُنا کہ سرکاری مشاعرے میں وقت مقررہ پر نہ پہونچنے سے بعض معزز شعرا معتوب ہوئے بغیر شرکت مشاعرہ واپس آنا پڑا - معمولاً بھی روزانہ دربار میں یاد فرمائی نہ ہوئی دو چار روز کے بعد معذرت آمیز عرضداشتیں پیش ہونے پر سرکار نے عفو سے کام لیا - سب حضرات باریاب ہونے لگے - قلق نے نہ عرضداشت بھیجی نہ کسی کی وساطت سے عذر خواہی کی سرکار نے پوچھا تو معلوم ہوا - قیام گاہ پر بغیر شرکت مشاعرہ واپس جاتے ہی روانہ لکھنؤ ہو گئے ؎

ریاض ایسا گیا گزرا نہیں ہے شان جانے دے — گدائی کے لئے وہ لیکے جام جم نکلتا ہے

حسب ایمائے سرکار امیر و داغ نے محبت نامے بھیجے۔ عفو کا یقین دلایا تھا۔ سب کے جواب آتے رہے مگر قلق نہ آئے۔ بہ ایمائے سرکار ماہوار تنخواہ لکھنؤ جانے لگی۔ کئی مہینے کے بعد خلد آشیاں کی دستخطی تحریر پہونچنے پر اس طرح آئے گویا گئے نہ تھے۔ گو لکھنؤ وہ اپنی پہلی حالت کی بازگشت کے ساتھ واپس ہوئے تھے۔ پھر بھی اپنی بات رکھی۔

منیر شکوہ آبادی

میں منشی اسمٰعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی سے جب ملنے جاتا۔ یا وہ تشریف لاتے۔ میری درخواست پر کچھ سناتے ضرور۔ ہر سنگلاخ زمین میں خاک اڑانا ان کا حصہ تھا اور نہ قادر وہ ہر رنگ پر تھے۔ غزل میں بہت شعر کہتے ہیں ——— زودگوئی میں عجب نہیں اسیر کے بعد ان کا درجہ ہو۔ مجھے ان کی دو غزلوں کے دو شعر اب بھی یاد ہیں اور ایک زبان کا بھی۔ زبان پر بعض کے نزدیک قادر نہ تھے۔ میں نے ان کی کسی لغزش کا ذکر کسی سے سنا نہیں۔ مرزا دبیر پر ناسخ کے اعتراضوں کا جواب انھوں نے دیا ہے۔ وہ رسالہ بھی شایع ہو گیا ہے۔ مگر میں رسالہ دیکھے بغیر اسوقت کچھ نہیں کہہ سکتا فرماتے ہیں ؎

داغ سجدہ ہے جبیں میں داغ میں خاک سجود — خط قسمت کی شکن میں گل ہے گُل میں خاک ہو

اس میں شکن قافیہ ہے۔ باقی ردیف دوسری زمین میں۔ نیل۔ بیل۔ قافیہ۔ (ہے) ردیف ہے۔

غُلّے ہماری خاک کے ہیں اُن کے ہاتھ میں — اس وصلِ مختصر کی بھی دشمن غلیل ہے

بھولے سے ... پھانس نکالی نہ ہمارے دلکی — ایک تنکے کے بھی شرمندہ تمھارے نہ ہوئے

رشک کے شاگرد تھے ان کا تتبع مایۂ ناز تھا۔ رعایت لفظی کے ساتھ اسی رنگ کے شعر زیادہ ان کے دیوانوں میں ہیں ؎

ہاتھوں سے ناپتے ہیں راہِ جنوں ، — آستینوں میں کوس پڑتے ہیں

روزانہ تار برقی

جنگ روم و روس کے زمانے میں اودھ اخبار لکھنؤ کے سوا کوئی اُردو اخبار روزانہ نہ تھا۔ میں نے ایک پرچہ خیرآباد سے موسوم بہ روزانہ تار برقی نکالا تھا۔ جس کی ترتیب اور تار برقی وغیرہ کے تراجم کا انتظام پائنیر اور دیگر انگریزی اخبارات سے محمد نور خانصاحب رسالدار و رسالہ دار و دیگر افسران رسالہ نے انگریزی اور فوجی کلب سے کر دیا تھا اور سیتاپور میں اشاعت و فروخت کا انتظام مسٹر ---- انسپکٹر لین نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ یہ سیتاپور میں جتنے گہرے دوست میرے تھے اتنے ہی دشمن گورکھپور جاکر بزمانہ سپرنٹنڈنٹی ہو گئے تھے۔ یہ پرچہ کتابی تقطیع کے دو ورق پر چھپتا تھا۔ قیمت ایک پیسے کے دو پرچے مگر سیتاپور و خیرآباد کے سوا اور مقامات پر ایجنٹ ہی ایک پیسے کو فروخت کرتے تھے۔ یا جیسا موقع ہو۔ زیادہ تر کام کرنے والے احباب تھے۔ بعض کے پاس ریاض الاخبار بھی بلا قیمت جاتا تھا۔ ہر گلی کوچہ میں مختلف مقامات پر ذریعہ پیکٹ کارپردازوں معرفت سے فروخت کے انتظام میں اولیت ریاض الاخبار پریس خیرآباد ہی کو ہے۔ ریاض الاخبار کو بھی ولایتی اور ہندوستانی انگریزی اخبارات کے چیدہ و دلچسپ تراجم جنگ کے متعلق جیسے ملتے تھے شاید اس وقت کسی دوسرے ہفتہ وار اخبار کو نہ ملتے ہوں۔ غازی عثمان پاشا معروف بہ رستم پلونا کی آخری جنگ روس و رومانیہ و بلگیریہ سرویہ سے زار روس کی کمان میں جس تفصیل اور جس شان سے ریاض الاخبار میں چھپی ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ مگر اس وقت کے پرچے اب کہاں ؟

سب سے تم اچھے ہو تم سے مری قسمت اچھی ۔۔۔ یہی کم بخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی

ایک خاص واقعہ اس شعر نے زبان پر آتے ہی افسانہ از فسانہ می خیزد کی ٹھہرا دی ایک واقعہ یاد آگیا جو پردہ و پردہ دری و بے پردگی کے ارتقائی مدارج آزادی کے نتائج پر بغیر مبسوط اخباری آرٹکل کے کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔ پردے میں ایسے واقعات دو چار مگر بے پردگی میں فی صدی سے بھی متجاوز۔ ع

دامن یار خدا ڈھانک لے پردہ تیرا

میں کسی دور مقام پر ایک ایسے مقتدر بزرگ رئیس کے مکان پر مہمان تھا جس سے خاندانی روابط و تعلقات کی وجہ سے میرا زمانۂ طفولیت وہیں گزرا تھا، اب بھی میری خاطرداشت زنانخانے میں ویسی ہی تھی جیسی بچپن میں گھر کی بیبیاں پرانی مامائیں مجھے اُسی نظر سے دیکھتی تھیں۔ کھانا دونوں وقت۔ دو وقتہ ناشتہ بھی ان اوقات میں کھانے کے تخت یا پلنگ کے قریب ان کی دونوں ناکدخدا صاحبزادیاں دوہری چادر کے پردہ میں وہیں آبیٹھتیں اور بیبیاں پردہ نہ کرتیں (اتنا لگاؤ بھی بُرا تھا) ہر چند یہ کان کا پردہ یا صرف آنکھ کا پردہ نہ تھا۔ ضروری نوشت و خواند و مسائل کی تعلیم اونچے شریف گھروں میں رواج پا چکی تھی ابھی یہ کہنے کا موقع دور تھا۔ ریاض

کھل کھیلنے کو پردہ نشیں پاتے ہیں تعلیم ۔۔۔ کچھ آپ زمانے کی ہوا دیکھ رہے ہیں

آواز کا لگاؤ کان کے پردے سے۔ ادب و تہذیب کے حدود میں بے تکلفانہ تھا۔ جو مزاج پرسی اور گھر کے حالات دریافت کرنے میں گو نہ بد نما نہ تھا نہ اس کا موقع دیتا تھا۔ ع

اور کھل کھیلیں گے دو چار ملاقاتوں میں

شرعی و رسمی حجاب کی نگہداشت بہ شدت ملحوظ رہتی۔ عام اس سے کہ اور بیبیاں بیٹھی ہیں یا نہیں۔ قصبات میں نامحرم اعزہ اُس زمانہ میں بھی محرم سمجھے جاتے تھے اور یہ بدنما رواج کبھی کبھی کسی حد پر شرمندگی کا باعث ہوتا تھا۔ میں اعزہ سے نہ تھا۔ بیگانہ تھا۔ مگر اعزہ سے کم نہ تھا۔ خاندانی شرافت ایک حد تک صفات پر خامیٔ عمر میں بھی اثر انداز رہتی ہے نیز پاکیزگی کی تعلیم بھی۔ بالاینہمہ ع

بسا کین دولت از گفتار خیزد

رکنے والی چیز نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اتفاقات نے یہ ترقی اور یہ صورت بھی پیدا کر دی۔ ع

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

میں نے دراز افسانے کو بہ طرز اختصار گویا ایک مصرع میں لے لیا۔ مجھے افسانہ نما بیان میں ہر موقع پر (بشرطیکہ لکھ سکوں) اپنی گریز یا طولانی عمر کو آخری سانس کی طرح کوتاہ کرنا ہے۔ افسانہ نگاری سے بھی نابلد ہوں۔ خواہ بہ طرز قدیم ہو یا جدید۔ اس اعتبار سے کہ گانا رونا کون نہیں جانتا۔ بُرے بھلے اسلوب سے کچھ لکھے جاؤں۔ مگر میں زندگی کے اُس نازک موقع پر پہونچ چکا ہوں کہ عمر کوتاہ و افسانہ دراز کا حس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ یہ کہنے کو ہو ۔ ثاقب لکھنوی

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ۔۔۔ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

جینے سے جی اُکتا گیا ہے آخر کب تک جیوں۔ پھر بھی جی نہیں چاہتا کہ وہ نازک وقت آئے۔ جسے وصال سمجھ رہا ہوں۔ دعا ہے مجھے یہ کہنا پڑے مگر نہ کہنا پڑے تو اچھا ہے ۔ ریاض

وقت آخر یاد فرمایا مجھے کس حسن سے ۔۔۔ ہچکیاں یہ کہتی آئیں موت کا پیغام ہے

آغاز شباب کا خواب دیکھ رہا تھا کہ بڑھاپے نے موت یاد دلا دی۔

کسی کا دوسری سے سن میں بڑا ہونا۔ آنے والی قیامت کے فتنوں کو اپنی کف پا کے لئے برگ حنا بنائے ہوئے تھا۔ یہ بھی

قیاسی ہے۔ نظارۂ جمال کا کیا ذکر۔ نقشِ کفِ پا بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئے تھے۔ نہ نوشت و خواند اس پیام و سلام کا ذریعہ تھی جس کا امکان نشستگاہ میں نہ تھا۔ پیامی بھی ایک ضعیفہ تھی جس نے کئی حج کئے تھے اور جس کے خیال میں ایک دبے پاؤں چلنے والی چیز سے ہر صبح یوں کہہ دیا تھا ؎ ریاضؔ

اے نسیم سحری اس کو لئے جا سوئے بام   نفس سرد ہے نالہ نہیں فریاد نہیں

ہفتے کی طرح مہینے گزرتے گئے۔ طوفانی اشکوں کی گریز پائی چاہتی تھی نظارۂ جمال کی حسرت کو دل سے نکال لے جائے۔ مگر یہ اپنی جگہ پر تھی پردہ گہرا ہوتا گیا۔ آواز میں بھی پتی لگنے کی خلش پیدا ہوگئی۔ آبرو کے پاس نے میرے لئے بھی موقع کی نزاکت بڑھادی تھی۔ پھر بھی انتہائی جرأت سے عصمت مآب کو مطلع کئے بغیر ایک روز موقع مل جانے پر جب گھر کی بیبیاں کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں اور صاحب خانہ مع ضروری اشخاص کے علاقے پر تشریف لے گئے تھے۔ باب کعبۂ مقصود اندرونی جانب سے اس طرح بند تھا کہ دست دعا کی جنبش جب چاہے اُسے کشود کار کا ذریعہ بنائے۔

تاریک شب کے خطرناک حصے میں چھپتا اُس خوابگاہِ ناز تک پہونچا۔ جس کا نقشہ پہلے سے آنکھ میں تھا اور جہاں شمع کی دھیمی روشنی چھپے چہرے پر پڑ رہی تھی ؎ ریاضؔ

یار کے بند صبا آہستہ وا کرنے کو تھے   چوری چوری کچھ نہ پوچھو رات کیا کرنے کو تھے

جھجک بھی خوف بھی شرافت سے گرا ہوا فعل بھی گھیرے پر دے نے اور ڈرا دیا تھا کہ یہ کہنے کو نہ ہو ؎ ریاضؔ

اُٹھے فتنے نگاہ خشمگیں سے   گلے ملتے ہوئے چین جبیں سے،

چھپے چہرے سے آنچل کا سرکانا تھا کہ یہی صورت پیش آئی اگر ساتھ ہی نام نہ بتایا جاتا تو ایک ہی چیخ رسوائی کے لئے کافی تھی نظارۂ جمال کی حسرت نکلی مگر بُری طرح۔ حسن عشق سے زیادہ بیتاب تھا۔ شرعی جواز کے حدود میں آجانے کی کوشش تھی۔ بصورت حرماں نصیبی۔ جانِ زار جمال آفریں کے سپرد ہو چکی تھی۔ اشکِ پیہم و گریہ متصل نے والدین کو سعی جواز کی طرف آمادہ کر دیا تھا۔ بایں ہمہ ایک عفت مآب پردہ نشین کی شرافت نفس کسی نامحرم کی نگاہ کو کھل کر موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ بے پردہ آواز کی طرف سے حرف سعی جواز کا ایما اور مایوسانہ فوری بازگشت کی تاکید (برق حاصل) آئی نظارۂ جمال نے مجھ سے کچھ کہا تو یہی ؎

لپک شعلے کی ہے یا گلفشانی دیکھتے جاؤ   کلیم ان کی ادائے لن ترانی دیکھتے جاؤ

ناکامی مجھے اپنی جگہ پر واپس لائی۔ ابھی تک تو بساکین دولت از گفتار سے سابقہ تھا اب تو نظارۂ جمال نے ہجوم شرارہ برق نے مجھے نئے تجلی زار میں پہونچا دیا تھا۔ وطن واپس آنے پر میری تمام کوششیں جواز کے لئے ناکام رہیں۔ برعکس میری حالت میں تغیر پیدا کرنے کو میرا عقد جوار وطن میں کر دیا گیا اور افسانۂ محبت ٹریجڈی پر تمام ہوا۔ وہی پیامی ضعیفہ وطن میں میرے مکان پر یہ کہتی آئی کہ غم فرقت سے جاں بر ہونا محال تھا۔ کسی نے جانِ زار پہلے ہی جان آفریں کو سپرد کر دی تھی۔ آخر وہ وقت آگیا کہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ ؎ ریاضؔ

کفن سرکا کے حسن نوجوانی دیکھتے جاؤ   ذرا اُفتاد مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ

ریاض کی شوخ نگاریاں

ریاض اور ان کی شاعری کا چرچا میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر میں سنا۔ میری عمر بہت کم تھی اور میرا ادبی شعور ابھی نشوونما اور تربیت کے دور سے گزر رہا تھا۔ اپنے مطالعہ سے میر کے تغزل اور غالب کے تفکر کا معترف تھا۔ اُردو شاعری کی قلمرو میں اس وقت امیر اور داغ کے سکے چل رہے تھے۔ لیکن اپنے شہر اور خصوصیت کے ساتھ اپنے گھر میں جس شاعر کی دھوم رہتی وہ ریاض تھے جسکے نام کے آگے ایک مدت تک خیر آبادی کا تصور ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں آیا۔ ہم لوگ عرصہ تک ریاض کو گورکھپور کی چیز سمجھتے رہے اس لئے کہ گورکھپور ان کی جوانی کی جولانگاہ رہا اور بڑھاپے میں بھی وہ اپنے "داغ کہنہ" تازہ کرنے گورکھپور برابر آتے رہتے تھے وہ میرے خسر مولوی افراغ صاحب مرحوم سے ملنے آیا کرتے تھے جو ان کے جوانی کے رفیق تھے اور جن کے ساتھ مل کر وہ کسی زمانہ میں "تصویر" کے عنوان سے رینالڈ کے Bronze Statue کا ترجمہ کر رہے تھے۔ گورکھپور میں ریاض کے لئے دوسری کشش جناب مولوی سبحان اللہ مرحوم تھے جن کی بدولت وہ سال میں دو ایک مرتبہ کشاں کشاں گورکھپور ضرور پہونچ جاتے تھے غرض کہ مجھے اپنے شہر میں برابر ریاض کو دیکھنے اور ان کی شاعری اور شخصیت دونوں سے لطف اُٹھانے کا موقع ملجاتا تھا۔

ان گورکھپوری ملاقاتوں میں سب سے زیادہ پرکیف ملاقات وہ تھی جو ایک بار پروفیسر فراق کے مکان پر ہوئی۔ ریاض تمام دن وہیں رہے اور دن کا کھانا وہیں کھایا۔ ریاض کو اپنے اشعار یاد تو رہتے نہیں تھے۔ حضرت وسیم مرحوم اور ہم لوگوں کی مدد سے کچھ اشعار سنائے، اسی سلسلہ میں ایک نظم بھی جس کا عنوان "بیل" تھا۔ ہم لوگوں کو حیرت تھی کہ جو شخص صرف غزل گوئی اور وہ بھی ایسی شوخ اور شریر غزل گوئی کے لئے بنا ہو وہ ایسی مسلسل نظم کہنے کی بھی اُستادانہ مہارت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ اب اس نظم کا کوئی شعر بھی یاد نہ رہا

لیکن ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کا زمانہ تو لکھنؤ میں اکثر ریاض کی صحبت میں گزرتا تھا۔ نظیر آباد میں مرقع اور نگار کا دفتر ایک ہی احاطہ میں تھا۔ ایک طرف نیاز صاحب اور دوسری طرف وصل صاحب۔ امتیاز مرحوم وصل صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ میرا لکھنؤ جانا برابر ہوا کرتا تھا اور مہینوں قیام رہتا تھا۔ ریاض دسویں پندرھویں دن اکثر آیا کرتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب وہ سوتے سوتے پھر جاگ اُٹھے تھے اور اپنا "میخانہ" (دیوان) طیار کرانے کا سودا پھر ان پر سوار تھا۔ ریاض اور وصل صاحب اسی "خیالی" دیوان کی فکر میں شہر کا چکر لگاتے پھرتے تھے اور شام کو ریاض، نیاز صاحب۔ وصل صاحب۔ امتیاز صاحب اور میں ایک پنجتن بن کر بیٹھتے تھے اور بڑے انہماک کے ساتھ "دیوان ریاض" کے حلیہ اس کے بناؤ سنگار اور اس کے مستقبل پر بحث ہوتی تھی۔ کچھ دنوں تک تو روز کا یہ دستور تھا۔ مگر بالآخر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اتنا بھی طے نہیں ہو پایا کہ حاشیہ پر بیل کس وضع کی ہو اور یہ کوئی پہلا تجربہ نہ تھا اس سے بیس برس پہلے اسی گورکھپور میں "دیوان ریاض" کا جو اہتمام تھا اسے گورکھپور کا ہر شخص جانتا ہے۔ بہرحال ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا اور ریاض کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی۔

ریاض کا دیوان بالآخر چھپا مگر بہت بے وقت چھپا اس کو اب سے تیس سال پہلے چھپنا چاہئے تھا جبکہ امیرؔ اور داغؔ اور ان کی شاعری کے لوگ قائل تھے اور انھیں کے اسالیب کو شاعری کا سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا تھا۔ ریاض امیرؔ کے شاگرد اور کم سے کم غیر شعوری طور پر داغ کی ریس کرنے والے تھے۔ لیکن چونکہ انکی اپنی طبیعت میں ایک قسم کی چستی اور جولانی تھی، اس لئے تقلید میں بھی وہ اپنی ایک نرالی شان قایم رکھتے تھے۔ یہ شان کیا تھی؟ یہ بتانا مشکل ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریاض کی شاعری سے جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ ایک حد کے بعد قایم نہیں رہتا۔ اسی لئے بچپن میں بھی جب میں ریاض کا کلام پڑھتا یا سنتا تو معاً بےچینی کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کس طرح سے ریاض کا دیوان جلد چھپ جائے۔ غیر شعوری طور پر اسوقت بھی میرے دل میں یہ چور موجود تھا کہ ریاض کی شاعری میں جو مزا ہے وہ ایک عمر اور ایک حد کے بعد قایم رہنے والا نہیں۔ اور جب کوئی نیا دور شروع ہوگا اور زندگی اور ادب میں نئے میلانات اور نئے عنوانات پیدا ہو جائیں گے تو ریاض کے کلام کا لطف اور بھی پھیکا پڑ جائے گا۔ اب سے پچیس تیس سال پہلے۔ ہر اس شخص کی زبان پر جس کو اُردو شاعری کا تھوڑا بہت بھی شوق ہو۔ ریاض کے دس بیس اشعار ضرور ہوتے تھے اور اب مشکل ہی سے کسی کو ان کا کوئی شعر بغیر دماغ پر زور دئے ہوئے یاد آتا ہوگا۔

ریاض کی شاعری کا عنوان قایم کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ اس میں نہ تو کوئی اندرونی جذباتی اپچ ہے اور نہ کوئی معنوی میلان، کہنے کے لئے ریاض کی شاعری بھی غزل گوئی ہے اور اس کا موضوع بھی وہی معاملات حُسن و عشق اور وہی رندانہ بیباکیاں ہیں جو روز اول سے اُردو غزل کے روایات میں داخل ہیں لیکن ہم ریاض کی شاعری کو نہ صحیح معنے میں عاشقانہ شاعری کہہ سکتے ہیں اور نہ رندانہ۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر درحقیقت نہ کوئی عشق کی کیفیت ہے اور نہ ان کو حُسن کے ساتھ کوئی مستقل سنجیدہ تعلق۔ ان کے اشعار میں وہ عام وارداتی قسم کی دلباختگی بھی نہیں پائی جاتی جو جرأت اور داغ کے کلام کی ایک بہت ظاہری سی خصوصیت ہے اور رندی اور سرمستی کا تو ریاض کے یہاں کوسوں پتہ نہیں ہے۔ ریاض کے خمریات کا بہت چرچا کیا جاتا ہے لیکن اس میں لوگوں کو بڑا دھوکا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ریاض کے دیوان سے ایسے اشعار کثرت کے ساتھ اکٹھا کئے جا سکتے ہیں جن کا تعلق شراب اور اس کے لوازم سے ہے۔ لیکن ان میں سے ایک شعر بھی ایسا نہ نکلے گا۔ جس میں کیف یا جوش ہو۔ رندی اور مستی کی تاثیر سے انکا رندانہ کلام بھی خالی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اس کو خمریات کا نام دینا ایک طرح کا فریب ہوگا پھر ریاض کے کلام میں جو ایک حد تک لطف آتا ہے یا جو کم سے کم اب سے چند سال پہلے آسکتا تھا اس کی نوعیت کیا ہے؟

ریاض امیرؔ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے تھے۔ پھر اُن پر داغ کا بھی اثر تھا۔ اکثر وہ بڑی محنت اور جگر سوزی کے ساتھ اس کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ داغ کے ٹکر کی غزلیں کہہ سکیں۔ لہذا ریاض کی شاعری میں ایک لطف تو وہی ہے جو زبان اور اندازِ بیان کی برجستگی اور طراری سے پیدا ہوتا ہے اور جو امیرؔ اور داغؔ کی طرح ریاض بھی عوام الناس کے شاعر ہیں۔ اُن کے کلام سے ہر حیثیت اور ہر استعداد کا آدمی لطف اُٹھا سکتا ہے۔ زبان میں ایسی روانی اور بے تکلفی ہوتی ہے کہ اُن کا تصنع بھی اکثر بے ساختگی معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے
کیوں برے بنتے ہو تم ناحق کسی کے واسطے

سال بیٹے لیکے خم پھیری کو نکلے ہیں ریاضؔ
میکدے کچھ وقف ہیں ان شاہ جی کے واسطے

کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے
ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو

کسی سے وصل میں سنتے ہی جان سوکھ گئی چلو ہٹو بھی ہماری زبان سوکھ گئی،
چین جاکر نہ زمیں بھی نہیں اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں
اشک کے چلتے آہ کے مارے آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں
گلے ملنے جھجکی جھجک کر رکی رک کر کھنچی قاتل، تری شمشیر کو بھی ناز معشوقانہ آتا ہے
دستِ جنوں ستایا کوئی موج ہوائے نجد کیوں سو جگہ سے پردۂ محمل نکل گیا
سنجیدگی سے محفلِ ساقی میں بات کی ناصح سا بیوقوف بھی عاقل نکل گیا
وحشت زدہ ریاضؔ نہ زنداں میں رہ سکا لے کر وہ سب کے طوق و سلاسل نکل گیا

زبان کی یہ صفائی۔ محاوروں کا یہ رکھ رکھاؤ۔ الفاظ کی یہ رعایتیں ریاضؔ کی مستقل خصوصیات میں سے ہے۔ ثبوت میں اُن کا سارا کلام پیش کیا جاسکتا ہے۔

عبدالسلام ندوی نے "شعرالہند" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "تلامذہ امیر میں جو شخص داغؔ کا اصلی حریف خیال کیا جاتا ہو وہ حضرت ریاضؔ خیرآبادی ہیں"۔ یہ خیال صحیح ہے مگر صرف ایک حد تک امیرؔ کے جس شاگرد کے کلام میں داغؔ کا اصلی رنگ آپ سے آپ جھلک اُٹھا ہے وہ حفیظ جونپوری ہیں۔ لیکن جو شخص سب سے زیادہ داغؔ کا مقابلہ کرنے پر کمربستہ رہتا ہے وہ ریاضؔ خیرآبادی ہیں۔ اس وجہ سے داغؔ اور ریاضؔ کے کلام میں اکثر ایک ظاہری مشابہت پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر یہ مشابہت ہی مشابہت ہے۔ دونوں کی شاعری کا راز ایک نہیں ہے۔ داغؔ کی شوخیاں ایک مشاق و پختہ کار کی سی ہیں جو تمام معاملات میں ماہر ہے، جو ہر طرح کا سرد و گرم بلند و پست دیکھے ہوئے ہے، جس کے سامنے بڑے سے بڑے عیار معشوق کے ہتھکنڈے اور داؤ پیچ بیکار معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں واقعیت کا اثر بہت نمایاں رہتا ہے۔ داغؔ کی شوخیوں کو بچپن کی شرارت کہکر ٹالا نہیں جاسکتا۔ برخلاف اس کے ریاضؔ کی ہر بات میں ایک قدرتی بچپن موجود ہوتا ہے ان کی فحش سے فحش عریانیوں میں بھی ایک طفلانہ الھڑپن کی شان نکلتی ہے۔ ان کی شاعری پکار پکار کر کہتی ہے کہ "میاں زندگی نام ہے دم بھر ہنس بول لینے کا" ان کی حالت اس معصوم بچے کی سی ہے جو اہم سے اہم اور خطرناک سے خطرناک چیز کو کھیلنے کی چیز سمجھتا ہے اور پھر اسکو تھوڑی دیر تک ہنس کھیل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ بات نہ داغؔ میں ہے نہ اور کسی میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی شاعری کے محرک دو ہیں

ریاضؔ کی شوخ اور الھڑ طبیعت نے کبھی اس کو گوارا نہیں کیا کہ وہ معشوق کے سامنے ہار مان لیں وہ معشوق سے بڑھ چڑھ کر رہتے ہیں۔ اور بقول ہمارے دوست پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کے "حُسن کی شوخی و شرارت اس کی عشق کی بیباکی کے سامنے حسرت و بیچارگی میں تبدیل ہوجاتی ہیں" ریاضؔ خود ایک جگہ لکھ گئے ہیں:

نگہ سے بڑھ کے ہیں گستاخ دستِ شوق مرے نہ کوسئے گا ذرا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے مجھے،

یہی ریاضؔ کی شاعری ہے۔ انھوں نے اپنے کو عشق میں کبھی مجبور و مظلوم نہیں پایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوقوں نے جتنے ستم اب تک عاشقوں کی جان پر توڑے ہیں وہ ان سب کا انتقام لینے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ کبھی معشوقوں کے رحم و کرم کے محتاج نہیں رہے۔ جب جو جی میں آیا کہہ بیٹھے اور کر بیٹھے۔ چاہے معشوق راضی رہے یا ناخوش۔ ایک جگہ وہ بلبل کو صلاح دیتے ہیں:-

نہ رہنے پائے بلبل جی کی جی میں
کہ اب رس آ چلا ہے ہر کلی میں،

یہی ان کا شیوہ ہے وہ خود معشوق کی مرضی کا انتظار نہیں کرتے اور نہ اس کے "چیں بر جبیں" سے ڈرتے ہیں۔ بلکہ اُلٹے معشوق کو دھمکیاں دیتے ہیں:

کوئی مُنھ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

ایک جگہ معشوق کو ستاتے ہیں:

وصل کی رات نہیں چین سے سونے کے لئے
آرہی ہے یہ جماہی پہ جماہی کیسی،

ایک مقطع میں خود اپنے شیوہ کو بیان کر گئے ہیں:

میں ڈراتا ہوں یہ کہہ کہہ کے حسینوں کو ریاضؔ
جو نہ پورا ہو وہ ارمان مرے دل میں نہیں

یہ دھمکی بھی سنئے:

نکال دوں گا شبِ وصل بل نزاکت کے
ڈرا لیا ہے بہت تیوریاں چڑھا کے مجھے

کبھی کبھی ان کی زبردست بے نیازی اس حد تک بھی بڑھ جاتی ہے:

فتنہ کا گزر اس بھری محفل میں نہیں ہے
چل اے نگہ ناز جگہ دل میں نہیں ہے

ان کو نہ معشوق کی خفگی کی پرواہ ہے اور نہ اس کی کسی بات کی شکایت ہے۔

غرض کہ ریاضؔ معاملات عشق میں کبھی کسی سے دبے نہیں۔ وہ معشوق سے بھی زیادہ نازک مزاج اور زود رنج ہیں۔ بات بات میں روٹھ جاتے ہیں اور خود اُلٹے ان کو منانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے:

ہم سے دیوانے ریاضؔ اور کہاں نازک طبع
کہ جو وہ پھول سے بھی ماریں تو فریاد کریں

ان حسینوں نے کہا کیا کہ خفا بیٹھے ہو
بات کیا تھی کہ ریاضؔ آپ بُرا مان گئے،

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاضؔ
اک حسیں ہر وقت ہو ان کے منانے کے لئے

سب حسیں تم کو بنائیں گے ریاضؔ،
بات کہتے روٹھ جانا کچھ نہیں

معاملات عشق کی طرح ریاضؔ نے حشر کے مضمون کو بھی اپنی جدت آفرینی سے اپنا بنا لیا ہے۔ ذرا سنئے داور حشر کو وہ کس طرح پکارتے ہیں:

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے
خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے

وہ حشر کے دن بھی انھیں شرارتوں اور گنہگاریوں پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

پچھلے گناہ کیسے انھیں سے ملے نجات
محشر میں جو کئے ہیں انھیں کا حساب ہو

انھوں نے حشر کو بھی اور چیزوں کی طرح کھیل سمجھا ہے۔ چند اشعار مثالاً درج کئے جاتے ہیں:

قصد پر اپنے خجل ہوں کہ دمِ حشر ریاضؔ
دیکھ کر ان کو طبیعت مری چاہی کیسی

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہو
ہجوم حشر میں لے آئے ہیں پلا کے مجھے

فرشتے عرصہ گاہ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں
ہمیں بھی آج لطف لغزشِ مستانہ آتا ہے

شیخ اور واعظ کے ساتھ شعرا ہمیشہ بدزبانی اور دراز دستی کرتے آئے ہیں۔ لیکن ریاضؔ کا انداز یہاں بھی اچھوتا ہے جس شخص نے معشوق کو عاجز اور مجبور کر رکھا ہو وہ ان کے ساتھ کیا کچھ نہ کرے گا۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ ریاضؔ کی جوان اور شریر

طبیعت اس تضحیک اور استہزا کے موضوع کو چھوڑ دیتی۔ لیکن ان کے یہاں محض وہ تمسخر نہیں ہے جو اُردو شاعری کی ایک رسم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ جب زاہدوں اور واعظوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نوعمر لڑکا کسی بڈھے کو چڑھا رہا ہے اور اپنی اس حرکت سے پورا لطف اُٹھا رہا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ،
بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

یہ سُن کے نصف شب کو درِ میکدہ کھُلا
مانگی ہے اک بزرگ تہجد گزار نے

اے شیخ تو چُرا کے پئے جب کبھی پئے
تیری طرح کسی کی نہ نیت خراب ہو،

محفلِ مے میں ہیں زاہد کے فرشتے بھی شریک
یہ تکلف تو نہ تھے بزم میں ہم سے پہلے،

شب کو میخانے میں کیوں پہونچے تھے اے حضرت شیخ
کہئے اچھی تو کٹی قبلۂ حاجات کی رات

اپنے سر سہرے گنہ کا بار رہنے دیجئے
شیخ جی اچھی ہے یہ دستار رہنے دیجئے

جناب شیخ نے جب پی تو منھ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں،

محفل میں آج شیخ کہن سال ناچ لے
دو گھونٹ اسے پلا دو مے کہنہ سال کے

اُٹھوا دو میز سے مے و ساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اک بزرگ پُرانے خیال کے

محتسب آیا تو خم مجھ پر گرا،
میں گرا مینا گرا ساغر گرا

زلزلہ سا آ گیا آیا جو میں،
حضرت واعظ گرے منبر گرا

وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشوں کے ہمراہ
آج جنت میں ہمیں ناصح مغفور ملے

اُتری ہے آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا
طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اُٹھا تو لا

جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں ریاضؔ کے خمریات بہت مشہور رہیں۔ لیکن انھوں نے جتنے شراب کے مضامین باندھے ہیں وہ کیفیت سے خالی ہیں۔ ان کے یہاں کہیں سرشاری نہیں پائی جاتی۔ شراب کے ساتھ بھی وہ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ البتہ اس کھیلنے میں طرح طرح کے نئے انداز نکالتے رہتے ہیں۔ شراب کو انھوں نے اپنے معصومانہ لہو و لعب کی چیز بنا لیا ہے۔ جو ایک بچے کو اپنے عزیز سے عزیز کھلونے کے ساتھ ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ بھی ان کی شوخ اور چنچل فطرت شعری اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ کچھ مثالیں سامنے ہیں:

جہاں ہم خشت خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

ایک دوسری جگہ شراب کی تنزیہی قوت کا بیان ہے:

پاک و صاف ایسی ہے جس نے پی فرشتہ ہو گیا
زاہدو! یہ حور کے دامن میں ہے چھانی ہوئی

چند اشعار اور سنئے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ ریاضؔ نے شراب کو کس طرح سے بنایا سنوارا ہے:

کس غضب کی ہوا میں مستی ہے
کہیں برسی ہے آسمان سے آج

کاٹے کٹتی نہیں مجھ مست سے برسات کی رات
میکدہ والی ملے آج تو کچھ کام چلے

جس دن سے حرام ہو گئی ہے
مے خلد مقام ہو گئی ہے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی ـــ جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

مر گیا ہوں پہ تعلق ہے جو میخانے سے ـــ میرے حصّے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

دیدے تو میری جوانی ترے صدقے ساقی ـــ ہے وہی تیرے چھلکتے ہوئے پیمانے میں

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش کسکی ـــ مے پرستو یہ کوئی نام ہیں میخانوں کے

جامِ مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن ـــ سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

اک شے ہے بہرِ فاتحہ از قسمِ شہد و شیر ـــ اس فاتحہ کا بادہ کشوں کو ثواب ہو،

مے چُرانے میں ہمیں ہے یدِ طولےٰ کیسا ـــ ہم اُڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا،

جو مرے جام میں ہے پھول وہ چمن میں کہاں ـــ اب اس کے سامنے پھولوں میں رنگ و بو کیا ہے،

اب تک تو ان مضامین کا ذکر تھا۔ جس کو خاص ریاضؔ کا حصّہ کہنا چاہئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاضؔ جس مضمون کو اُٹھاتے ہیں اس کو اپنی شوخیِ فکر۔ اپنی ستھری زبان۔ اپنے اسلوب کی چستی و چالاکی سے بالکل اچھوتا بنا دیتے ہیں "طور و کلیم" کے چند مضامین ملاحظہ ہوں

دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا ـــ کلیم طور پہ ان سے جو گفتگو آئے

لگا کے کان ہم بھی ذرا دور سے سُن لیں ـــ کلیم سے یہ سرِ طور گفتگو کیا ہے

مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے ـــ بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا ـــ ہم آئے تو پردے سے باہر نہ نکلے

مگر یہاں بھی وہی چنچل پن موجود ہے۔

ریاضؔ کے اشارے کنائے بھی بڑے مزیدار ہوتے ہیں اوپر جو اشعار درج ہیں ان میں اکثر اس کی مثالیں ملیں گی دو ایک مثالیں اور پیشِ نظر ہیں:۔

پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہیں ـــ اور جو بے ساختہ آجائے تبسم مجھ کو

آ کے کچھ دل جلوں کی تربت پر ـــ کچھ سنو شمع کی زبان سے آج

غیر کے گھر سے جھجکتے ہوئے کیوں نکلے تھے ـــ رُکتے دیکھا تمہیں پھر چھپ کے نکلتے دیکھا

سایۂ تاک میں ہے دعوتِ زہاد ریاضؔ ـــ کہیں ہر دانۂ انگور نہ مینا ہو جائے

ریاضؔ کی زبان سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، ان کا کوئی شعر ایسا نہیں جس میں زبان اور اسلوب کا رکھ رکھاؤ نہ ہو۔ جس کا ثبوت پچھلی مثالوں سے مل سکتا ہے۔

ریاضؔ کے مقطعے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں جس کو ریاضؔ کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا وہ ان مقطعوں میں ان کی صحیح شبیہ دیکھ سکتے ہیں۔ ریاضؔ ان شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری شخصیت کی پوری آئینہ دار ہوتی ہے۔ ریاضؔ کی شاعری خود ریاضؔ کی ہو بہو تصویر ہے۔ جیسے وہ خود چلبلے رہے ویسی ہی ان کی شاعری چلبلی رہی۔ جیسے وہ خود آزاد اور بے باک رہے ویسی ہی ان کی شاعری آزاد اور بے باک رہی۔ اور یہ خصوصیت مقطعوں میں اور بھی نمایاں ہے:

ہے ریاضؔ اک جوان مست خرام ـــ نہ پئے اور جھومتا جائے،

وہ بیٹھے ریاض آج تو کچھ جھوم رہے ہیں
اب یہ بھی گنے جاتے ہیں مردانِ خدا میں

پیری میں ریاض اور معاصی کا بڑھا شوق
کمبخت گناہوں سے پشیماں نہیں ہوتا

ریاض ایسا گیا گزرا نہیں جو شان جانے دے
گدائی کے لئے وہ لیکے جام جم نکلتا ہے

چلتے ہیں جب ریاض تو کچھ جھومتے ہوئے
جیسے پئے ہوئے کوئی مست شراب ہو

ریاض اک چیز تھے اگر انسان ہوتے قرینے کے
مزے کے شخص ہیں لیکن طبیعت لاؤ بالی ہے

کہاں وہ نور کی صورت وہ نور کی آواز
ریاض کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

نظر بچائے بغل میں دبائے شیشۂ مے
کہیں ریاض پینے پلانے جاتے ہیں

آج سر پر لئے میخانہ ریاض آتے ہیں
کوئی کہہ آئے ذرا اہل حرم سے پہلے

ریاض اب کہاں وہ جوانی کا عالم
گلے سے لگاتے جوانی جو ملتی،

شیخ صاحب سوئے میخانہ ریاض آتے ہیں آج
فرش راہ میکدہ دستار رہنے دیجئے

محبت اور ان کافر بتوں سے
ریاض اس عمر میں اس مفلسی میں

بڑے پاک باطن بڑے صاف طینت
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں،

دُنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

یوں تو ریاض عمر بھر جوان رہے۔ اور جس کے ساتھ دم بھر کے لئے بیٹھے اس کو جوان بنا دیا۔ لیکن ریاض کی وہ جوانی جس کو عُرف عام میں بھی جوانی کہتے ہیں۔ واقعی دیوانی تھی۔ ان کی شاعری کا ایک ایک حرف اس کا غماز ہے اور گورکھپور کی سرزمین ان کے ولولۂ شباب کی شاہد ہے، گورکھپور نے ان کی جوانی کے لئے جولانگاہ مہیا کی اور انھوں نے اپنی شاعری سے گورکھپور کو غیر فانی کر دیا۔ ریاض نے عمر کا بیشتر حصہ گورکھپور کی سیر میں بسر کیا ہے۔ اور اس ''پورب دیس'' کی یاد آخر وقت تک ان کی روح سے لپٹی رہی وہ اس پیرانہ سالی میں بھی گزرے ہوئے زمانہ کی یاد تازہ کرنے گورکھپور برابر آتے رہے خود کہتے ہیں:

اے ریاض اس طرح آجاتا ہے دو دن کو شباب
داغ کہنہ تازہ کرلاتے ہیں گورکھپور سے

یہ شعر تو یہاں ہر شخص کی زبان پر ہے:

جوانی جن میں کھوئی ہو وہ گلیاں یاد آتی ہیں
بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور رہتا ہے

اور کون جانتا ہے ممکن ہے آج زیر خاک بھی یہ یاد ان کے ساتھ ہو اور خود ان کی پیشین گوئی سچ نکلی ہو:

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور
لحد سے آئے گی آواز ہائے گورکھپور

اسی سلسلہ میں گورکھپور کے متعلق چند اور اشعار سُن لیجئے:

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ہے خاک گورکھپور ہو جانا

اودھ کی شام بنارس کی صبح ہو صدقے
کہ اک جہاں سے جدا ہے ادائے گورکھپور

پکارتی ہیں یہی دلفریبیاں اسکی
کہ آکے ہو جسے جانا نہ آئے گورکھپور

ہم اپنے خون تمنا سے سیج آئے ہیں
حسیں لگائیں منگا کر حنائے گورکھپور

گورکھپور سے ریاض پھر لکھنؤ گئے اور اگرچہ اس واقعہ کو انھوں نے اس شعر میں بڑے اندازے بیان کیا ہے:

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشت شباب   جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ محض "شباب کی بازگشت" رہی اور ان کو پھر وہ "عیشِ زمانِ عاشقی" کبھی نصیب نہیں ہوا جس کی گورکھپور میں فراوانی تھی۔ اب ہم مختلف عنوانات کے چند اشعار منتخب کرکے اکٹھا کرتے ہیں:

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے   پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

آنکھوں میں شرارت ہے کہ روکے نہیں رکتی   شوخی ہے کہ بے چین ہے آغوشِ صبا میں

تمھیں کیونکر بتائیں دل پر اپنے کیا گزرتی ہے   تمھیں کیونکر دکھائیں تم میں کیا عالم نکلتا ہے

سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لیکے بیٹھے ہیں   رفو کرنے کو تار دامن مریم نکلتا ہے،

آخری شعر میں شاعر کے چنچل تخیل نے جو تصویر پیش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ایک طرف اپنی آسودگی کی سرمستی اور اپنے فتوحات کا پندار دوسری طرف ایسے بھولے بھالے معشوق کی مجبوری اور بے چارگی جس کے چاک دامن پر "دامن مریم" بھی قربان۔ ہر شخص کا تخیل اس عالم کو پا نہیں سکتا:

رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا   وہی جلوہ آرائے محشر نہ نکلا،

نزع میں یار سے پیمانِ وفا کرتے ہیں   اس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

یاں وہ لے دے ہوئی آکر کہ الٰہی توبہ   ہم یہ سمجھے تھے کہ محشر میں تماشہ ہوگا

قیامت اور قیامت میں آئی خوب ہوا   بتوں نے چھیڑ دیا سامنے خدا کے مجھے

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اڑا دئے   جس غنچہ پہ نگاہ پڑی دل بنا دیا

اتنے لئے کہ آؤ بھگت میکدے میں ہو   پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بنا دیا

مجھ سے بے پردہ ملے۔ ملکے کیا گم مجھکو   ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھکو

ریاض اک عمر گزری دیر میں آئے تو اب تک   حرم میں گونجتی پھرتی ہے راتوں کو اذاں میری

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی وہ بھی کعبہ میں   بھلے کو میں دبا لایا تھا ناقوس برہمن کو

عالم ہو میں اک آواز سی آجاتی ہے،   چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

رہ گئے تھے یونہی ہم جا کے کبھی رات کی رات   مدتوں یاد رہی ہم کو خرابات کی رات

یہ بدلنے کا نہیں لاکھ زمانہ بدلے،   مجھ سے بدبخت کا دن غیر سے بدذات کی رات

نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی،   قرض پی آئے اک دوکان سے آج

کوئی جاکر ریاض کو سمجھائے   کچھ خفا ہیں وہ اپنی جان سے آج

کبھی کچھ رات گئے اور کبھی کچھ رات رہے   ہم نے ان پردہ نشینوں کو نکلتے دیکھا

جو گونج اٹھی بالے کی جھنجلا کے بولے،   لگے پیار کو آگ ابھی کان جاتا

اٹھتے ہیں طوفِ حرم کو ہم بھی اے زاہد ٹھہر   دور آخر ہے یہ ساغر کا ابھی پی کر اٹھے

اتنی کثرت سے ارے ساقی اور اتنی تند و تیز — اچھے اچھے پینے والے آج توبہ کر اٹھے

ریاضؔ خضر صورت جب سوئے میخانہ آتے ہیں — تو فوراً سر بمہر اک خم لئے پیمانہ آتا ہے

کیا جانے بات پہونچے یہ کس کس کے کان تک — مجھکو دبی زبان سے کوسا نہ کیجئے

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی — ہم رند سُن کے قلقلِ مینا کہیں جسے

ہے ابھی میرے بڑھاپے میں جوانی کیسی — ہے ابھی ان کی جوانی میں لڑکپن کیسا

شوخی سے چمک کر اِدھر آئے اُدھر آئے — محشر میں بھی دیکھا تو تمھیں تم نظر آئے

گُل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے — شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

ریاضؔ کے "لسان العصر" ہونے میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجایش نہیں۔ وہ یقیناً اپنے زمانہ کی آواز تھے اور ایسی آواز جسکے آگے ہر آواز کچھ بیٹھ سی گئی۔ وہ زبان پر وہی قدرت رکھتے تھے جو ایک کھلاڑی یا بازیگر اپنے تماشوں پر رکھتا ہے۔ اُن کی شاعری ایسی فقرہ بازی ہے جو کسی وقت کسی صحبت میں زچ نہیں ہوتی۔ بعض نقادوں نے شاعری کو فاضل قوت کا مظاہرہ بتایا ہے۔ کم سے کم ریاضؔ کی شاعری یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بلوغ کے بے چین دورے سے گزر رہا ہے اور اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے۔ قوت اور توانائی کی فراوانی کا بڑھتا ہوا احساس اس کو طرح طرح کی دلچسپ حرکتیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے اور یہ حرکتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ اور بوڑھے سے بوڑھے آدمی کو تھوڑی دیر کے لئے ایسا مزہ آتا ہے کہ وہ اپنی ساری بزرگی اور سنجیدگی بھول جاتا ہے۔ جیسے بچوں کے بعض کھیل ہوتے ہیں مثلاً پتنگ بازی کہ سن رسیدہ سے سن رسیدہ اور مشغول سے مشغول ہستیاں بھی ایک مرتبہ نظر اُٹھا کر کچھ دیر کے لئے محو ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ معاً یہ بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ بچوں کا کھیل ہے۔ زیادہ وقت نہ دو ورنہ کام کا حرج ہو جائے گا۔ ریاضؔ کی شاعری میں ہم کو بڑا مزہ آتا ہے مگر اول تو یہ سارا مزہ نوعمری کی ایک خاص منزل تک محدود ہے دوسرے سنجیدہ عمر والوں کو اس میں جو لطف آتا ہے وہ زیادہ دیر تک قایم نہیں رہتا۔ مہدی حسن افادی الاقتصادی مرحوم نے ایک مرتبہ ریاضؔ کو "بوڑھے بچّہ" کا خطاب دیا تھا۔ میرے خیال میں ریاضؔ شخصی اور شاعرانہ دونوں حیثیتوں سے کبھی "بوڑھے بچّے" کی حد سے آگے نہیں بڑھے۔

مجنوںؔ گورکھپوری

"نگار"

جنوری-فروری سنہ ۴۱ء اور جنوری-فروری سنہ ۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو آپ طلب فرمالیجئے یا ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں تو دوسرا ابھی منگا لیجئے، ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اردو شاعری نمبر، ہندی شاعری نمبر کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔ ان دونوں نمبروں کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اسوقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کر سکیں گے۔

دونوں کی قیمت تین روپیہ (علاوہ محصول)

مینجر نگار

ریاض کی شوخیاں

(۱)

خلد آشیاں کی رحلت کے بعد حضرت ریاض مولانا شرر اور اڈیٹر پیام یار بہ ایمائے امیر مینائی رامپور گئے، اسوقت مراد آباد میں ریل سے اتر کر رامپور سواری پر جانا پڑتا تھا۔ سمیع اللہ خاں بہادر مرحوم کے صاحبزادے بھی لکھنؤ سے شریک سفر ہوئے رات لطف سے باتوں میں گزری پچھلے کو سوئے تو مراد آباد سے نکل کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن کاٹھ پر آنکھ کھلی، گاڑی کم ٹھہرتی تھی بہ ہزار دقت اُترے نہ کھانے کا سہارا نہ پان تماکو کا۔ بنگالی اسٹیشن ماسٹر نے خشک جواب دیا۔ قصبہ چار پانچ میل، مراد آباد جانے کو ریل جانے کا وقت ساڑھے تین بجے کے بعد اسباب ایک ریلوے ملازم کے سپرد کیا۔ بھوک کی شدت میں بازار کا سہارا کاٹھ کی طرف لے چلا۔ جتنا آگے بڑھتے منزل دور ہو جاتی، آخر دور سے کچھ شاندار عمارتیں نظر آئیں ڈھارس ہوئی کہ شاید بازار کی خاک نہ پھانکنا پڑے۔ دربان سے معلوم ہوا کہ یہاں کے زمیندار چودھری نندھان سنگھ ہیں جو معہ اہل و عیال کے مراد آباد گئے ہوئے ہیں یہاں نائب صاحب ہیں اور وہ مسلمان ہیں۔ کئی صحن طے کر کے دیوان خانہ تک رسائی ہوئی شاندار دالان در دالان میں سفید چاندنی کا فرش گرد دیوان، متصدی سُرخ سُرخ کھاتے کھولے ہوئے۔ دونوں دالانوں کے وسطی در میں مسند بھی گاؤ تکیہ بھی نائب صاحب بھی، بہت بڑا شاندار پیچوان منہ سے لگا ہوا۔ ناخواندہ مہمان لب فرش حاضر، نگہ روبرو کہنے والا کوئی نہیں نائب صاحب کی نظر کا غذات پر جمی ہوئی کچھ دیر انتظار کی تکلیف اُٹھا کر حضرت ریاض نے بلند آواز سے اسلام علیکم کہا جواب میں نظر اُٹھی مگر غضبناک!

39283

ناخواندہ مہمانوں کی صورت سائلانہ نہ تھی مگر آمد سائلانہ تھی اب انتظار فضول تھا حضرت مرحوم آگے بڑھکر نائب صاحب کے برابر مسند پر جا بیٹھے۔ نائب صاحب کا یہ عالم کہ: "غصہ مرے ناک کا اُترتا ہی نہیں ہے"۔ حاشیہ نشینانِ بساط پر جرمانے کے پردے میں غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد نائب صاحب نے دوسری شکل کھینچی تو ریاض صاحب نے دست بستہ عرض کیا، ہم لوگ نام سُنکر دور سے آئے ہیں سُنا ہے حضور کو موسیقی کا شوق ہے۔ چیں بجبیں ہو کر فرمایا" بالکل نہیں، چودھری صاحب مراد آباد میں ہیں وہیں جاؤ"۔ ریاض صاحب نے کہا ہم ان کی واپسی کا انتظار یہیں کریں گے کھانے کا انتظام فرما دیا جائے۔ نائب صاحب نے رخ پھیر کر بلند آواز سے کہا کوئی ہے، دو تین گنوار سپاہی جھپٹے۔ وقت نازک آجانے سے اڈیٹر صاحب پیام یار کو تاب نہ رہی ایک ہی سانس میں کہہ گئے یہ حضرت ریاض مالک ریاض الاخبار ہیں، یہ مولانا عبد الحلیم شرر اڈیٹر دلگداز ہیں، میں نثار حسین مہتمم پیام یار ہوں ساتھ ہی اصل واقعہ بھی بیان کر دیا۔ نائب صاحب عرق عرق۔ "لاحول ولا قوۃ۔ غضب کیا" کہتے ہوئے اُٹھے ہر ایک سے معانقہ کیا۔ اسٹیشن سے اسباب لینے کو آدمی دوڑائے، حضرت ریاض کے دل میں گدگدی، کاش تفریح کے لئے ہارمونیم یا کوئی اور ساز ساتھ ہوتا تو نثار حسین صاحب کو صفائی میں دقت پیش آتی۔ سب مہمان لقصف گھنٹہ کی معذرت کے ساتھ ایک مکلف کمرے میں پہونچائے گئے۔ پنکھے کی ہوا مولانا شرر اور جناب نثار کو ٹھنڈا نہ کر سکی حضرت ریاض پر غصہ کہ بے وجہ آبروئی تھی آپ نے فرمایا کہ موجودہ عزت اسی مذاق کے صدقے میں ہے۔ یہی گفتگو پیش تھی کہ نائب صاحب سر کو جنبش دیتے "لاحول ولا قوۃ اور غضب کیا"

کو تکیہ کلام بنائے ہوئے آئے کہا کہ تکلیف نہ ہو تو عمارتیں، دفاتر اور باغات ملاحظہ فرما لیجئے واقعی ہر چیز قابل تعریف تھی۔ خوش سلیقگی کی حد نہ تھی۔ ایک بجے واپس آئے۔ دسترخوان مختلف الاقسام کھانوں سے بھرا تھا مایوسانِ رزق نے سیر ہو کر کھانا کھایا، کچھ دیر استراحت کی۔ نائب صاحب کو دو چار روز قیام پر اصرار تھا مگر موقع نہ تھا آخر روانہ ہوئے، ایک ہاتھی پر حضرت ریاضؔ اور نائب صاحب دوسرے پر مولانا شررؔ اور جناب نثارؔ۔ نائب صاحب نے ضد کر کے دوسرے درجہ کے ٹکٹ ناخواندہ مہمانوں کے واسطے لئے۔ یہ واقعات گو چھپائے گئے مگر منشی امیر احمد صاحب کو معلوم ہو گئے، رامپور میں اب نہ وہ صحبت تھی نہ وہ لوگ۔ مرزا شاغلؔ صاحب برادر داغؔ نے دھوم دھامی دعوت کی اور پیام یارؔ کی طرح پر اپنی غزل کا یہ مقطع اظہار مدعا کے لئے لکھ کر بھیجا

شررؔ۔ نثارؔ۔ ریاضؔ آئیں شوق سے شاغلؔ

غریب خانے میں طیار ماحضر بھی ہے

دعوت خوب تھی مگر کا ٹھ کا لطف نہ تھا۔

(۲)

پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، حضرت ریاضؔ سے بہت بے تکلف تھے، ہم مشرب بھی سمجھتے تھے، ریاض الاخبار کے نامہ نگار بھی تھے، ایک روز آپ نے حضرت ریاضؔ کو پیام دعوت دیا حضرت ریاضؔ نے دعوت منظور کر لی، پنڈت جی آپ کو لیکر مرے کمپنی کے ایک خاص کمرے میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر میں میز پر وہ سامان آگیا جس کے حضرت ریاضؔ نظم میں خوگر تھے یہ سامان دیکھ کر حضرت ریاضؔ کے ہوش اُڑ گئے۔ مگر سرشارؔ صاحب کے خوش کرنے کو اس سے پیشتر کہ بوتل سے جام میں آئے اور جام سے لب تک۔ حضرت ریاضؔ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں دفعتاً آپ سرشارؔ صاحب سے ”دو منٹ“، کہکر کچھ اس انداز سے اُٹھے گویا ابھی واپس آتے ہیں مگر واپس آئے تو کب اور کہاں۔ بیس سال کے بعد دکن میں حضور مہاراجہ پیشکار بہادر کے کاشانے پر۔ یہاں حضرت ریاضؔ، سرشارؔ صاحب کے مہمان نہ تھے، لیکن مہاراجہ پیشکار بہادر کی طرف سے حضرت ریاضؔ کی خدمتِ مہمانداری جناب سرشارؔ کے سپرد تھی۔ دکن میں بھی اس واقعہ سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا۔ حضرت ریاضؔ ایک شب جریدہ روزگار مدراس کے اڈیٹر سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ سنہ ۵۷ء والے دربار دہلی کے بچھڑے ہوئے مدت مدید کے بعد ملے، بہت سے احباب اور مشتاقینِ حضرت ریاضؔ جمع ہو گئے۔ عفوؔ صاحب بھی آئے اور دکن کے مشہور درباری شاعر گرامیؔ بھی۔ گرامیؔ کے ہمراہ ایک موقر ایرانی شاعر بہ اصرار حضرت ریاضؔ کو اپنی فرودگاہ پر لے گئے۔ دو چار ہم مشرب اور ہم مذاق اور بھی شریک صحبت ہوئے یہاں بھی تکلف کے ساتھ میز پر وہی مرے کمپنی والا سامان آگیا۔ حضرت ریاضؔ نے بھی دستِ شوق بڑھایا پھر کچھ جھجھکے اور کہا کہ طبیعت مانتی نہیں، لیکن جگر کی خرابی کی وجہ سے ڈاکٹر نے ایک سال کے لئے قطعی ممانعت کر دی ہے۔ انکار سے پارسائی کا یقین نہ ہوتا، لیکن اس تدبیر سے

”رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی“

(۳)

حکیم عبدالوالی صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ نثار حسین مہتمم پیام یارؔ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، چوک میں سید حسین خاں کے پھاٹک کے پاس عطر اور تیل کی دوکان تھی جو کسی زمانہ میں شام کو مشہور مصنفین و شعراء کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ سرشارؔ۔ سجاد حسین۔ شررؔ۔ ریاضؔ۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ اکبر الٰہ آبادی۔ شبلیؔ سب اس دوکان پر دل بہلانے بیٹھ چکے ہیں۔ اسی دوکان کا قصہ ہے کہ ریاضؔ اپنے اسی قسم کے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے، ہنسی مذاق ہو رہا تھا، مٹھائی کھانے کی ٹھہری۔ حضرت ریاضؔ دوستوں سے کسی بات پر بگڑے اور کہا کہ میں

قوت بازو کی روٹی کھاتا ہوں، مٹھائی بھی زور بازو کی کھاؤں گا، دوستوں کو معلوم تھا کہ اسوقت ان کی جیب میں کچھ نہیں ہے اسلئے ان کا چیلنج قبول کر لیا گیا۔ ایک خدمتگار کھڑا تھا ریاضؔ نے اُسکی بغل کی چادر گھسیٹ لی، اور چلدئے، پندرہ منٹ گزرے ہونگے کہ دیکھا پیسے ہاتھ میں چھنکاتے ہوئے آرہے ہیں، خدمتگار کو چادر واپس کی اور بارہ چودہ آنے پیسے دئے اور حکم دیا کہ سیر بھر امرتیاں لے آ، اور جو کچھ پیسے بچیں خود لے لے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فقیروں کا بھیس بنا کر اکبری دروازہ سے گول دروازہ تک گئے جو شریف مرد آدمی ملا اس سے ایسے الفاظ اور ایسے انداز سے مدد کے طالب ہوئے کہ جو جس کے پاس تھا دیدیا۔

(۴)

جھوائی ٹولہ کے خواجہ فریدالدین عرف فدنؔ صاحب حضرت ریاضؔ کے بچپن کے دوست تھے دس پندرہ برس کے بعد ریاضؔ لکھنؤ آئے تو ان سے ملنے گئے۔ اتنی مدت کے بعد بعد صورت میں فرق ہو جاتا ہے کچھ اسوجہ سے اور کچھ اسوجہ سے کہ اپنے کام میں معروف تھے دیکھتے ہی ان کو پہچانا نہیں فوراً ریاضؔ کو شرارت سوجھی۔ مودبانہ سلام کرکے دُور ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ مغرب کا وقت تھا کام زیادہ تھا اسلئے خواجہ صاحب پریشان تھے ان کی طرف مخاطب نہ ہو سکے۔ اتنا وقت جو حضرت ریاضؔ کو ملا تو پوری اسکیم طیار کر لی اب جو فدنؔ صاحب مخاطب ہوئے اور پوچھا آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں تو حضرت ریاضؔ نے کہا حضور میں شیخ اصغر علی کے کارخانے سے آیا ہوں آپ کے یہاں کچھ عطر اور تیل آیا تھا اسکے چودہ روپیہ بارہ آنے باقی ہیں۔ خواجہ صاحب حساب کتاب اور لین دین کے صاف آدمی تھے، اس لئے سنکر برہم ہوگئے، ریاضؔ انکی اس عادت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ فدنؔ صاحب نے کہا کیسا روپیہ میں نے آجتک کسی جگہ سے کوئی چیز قرض نہیں منگائی ہے۔ حضرت ریاضؔ نے جواب دیا میں کیا جانوں شیخ صاحب جھوٹ کہتے ہوں گے۔ "شیخ اصغر علی صاحب بھی فدنؔ صاحب کے گہرے دوست تھے ان کی شان میں یہ کلمہ نہ سُن سکے پوچھا یہ تو بتایئے آپ ہیں کون۔ حضرت ریاضؔ نے کہا ایک دفعہ تو عرض کر چکا ہوں۔ کہئے تو کعبے کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہوں۔ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کے کہوں۔ یہ جواب سُنکر خواجہ صاحب آگ ہو گئے کہا تم بڑے گستاخ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ حضرت ریاضؔ نے جواب دیا بجا ہے چیز لیکے روپیہ نہ دیں اور جب تقاضہ کرنے آدمی آئے تو اسکو گستاخ بنائیں۔ یہ تو تو میں میں ہو ہی رہی تھی کہ ہادی علی خاں آگئے یہ بھی ان دونوں کے بچپن کے دوست تھے۔ حضرت ریاضؔ کے دو ہی چار روز آگے پیچھے انکا بھی انتقال ہوا ہے۔ انھوں نے ریاضؔ کو پہچان لیا اور بول اُٹھے ارے فدنؔ تو نے نہیں پہچانا۔ اب جو خواجہ صاحب نے غور سے دیکھا تو دوڑ کر لپٹ گئے۔

(۵)

حضرت مرحوم خیرآباد میں خانہ نشین تھے اور وصلؔ صاحب نے لکھنؤ سے "مرقع" نکالا تھا۔ دیرینہ تعلقات اکثر آپ کو لکھنؤ کھینچ لیجاتے تھے۔ زمانۂ قیام لکھنؤ میں کیننگ کالج کے کچھ طلبہ اکثر آپ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے اور نہایت ادب و عقیدت کے ساتھ آپ کی زبان سے آپ کا کلام سنتے تھے ریاضؔ بوڑھوں میں بوڑھے اور بچّوں میں بچّہ تو تھے ہی۔ طلبہ نے ایک مرتبہ جرأت کرکے آپ سے سینما دیکھنے کا اصرار کیا آپ نے وعدہ فرمالیا۔ شام کو حسب وعدہ طلبہ کی ایک فوج آپ کی قیادت میں سینما گھر چلنے کے لئے آپہونچی آپ اس وقت بیٹھے وضو کر رہے تھے، لڑکوں کو دیکھ کر مسکرائے اور اپنی لمبی سفید داڑھی کو اُنگلیوں کے جال میں پھنسا کر یہ شعر پڑھا:۔ اے تماشہ گاہِ عالم ریشِ تو ؛ تو کجا بہرِ "سینما" می روی

(۶)

اسی طرح ایک مرتبہ لکھنؤ ہی میں ایک مجمع میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے اور صنفِ نازک کی رنگین ساریوں کو نظر شوق سے دیکھ رہے تھے، کالج کے نوجوان طلبہ کی ایک پارٹی وہاں موجود تھی۔ اتفاق سے حضرت ریاضؔ بھی ادھر سے گزرے مجمع دیکھ کر ٹھہر گئے۔ طلبہ کی نظر آپ پر پڑی تو سب ادھر متوجہ ہوگئے اور ایک زبان ہو کر عرض کیا کہ آپ اس مجمع میں کیا دیکھ رہے ہیں۔ جواب میں برجستہ ارشاد فرمایا:۔ "ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں"

سید عقیل احمد جعفری

ریاض کی شگفتہ نگاری

ریاض "پرانی دنیا" کا نمایندہ اور قدیم صحیفۂ شاعری کا آخری ورق ہے۔ جو لوگ اس کی شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں اُن کو چاہئے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کی اس فضا میں لے جائیں جس کی تعمیر (باوجود قومی اور سیاسی انحطاط کے) بجز جوش و سرمستی، خندہ و قہقہہ اور ہوسِ ناؤ نوش کے اور کسی چیز سے نہ ہوئی تھی، جہاں مژدۂ وصال اور نظارۂ جمال ہی زندگی کا سہارا تھا۔ جہاں کی محفلِ سخن صہبائے آمیر سے جھوم رہی تھی اور جہاں شاعری، شوخی و شیرینی، سجاوٹ اور بانکپن کا دوسرا نام تھا۔ اگر ہم نے اس کی شاعری کو آج کل کے معیار سے جانچا تو ہمیں سخت مایوسی ہوگی اور یہ حقیقتاً ایسی ہی تاریخی غلطی جیسے کہ ہم چندر گپت موریہ یا علاؤ الدین خلجی کو اس زمانہ کے معیار سے جانچیں اور اُس کو ایک ظالم و جابر بادشاہ ٹھہرا کر اپنی تنقید ختم کردیں۔ ریاض کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول اور اُس وقت کے اجتماعی اور معاشرتی میلانات کو جاننا ازبس ضروری ہے۔ اسکی شاعری پر تنقید بھی میتھو آرنلڈ یا کارل مارکس کے اُصول کی روشنی میں نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے لئے والٹر پیٹر کا یہ نظریہ سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ ادب کی غایت لذت و انبساط کے سوا اور کچھ نہیں ہے"۔

متاخرین کا دورِ اول، اُردو غزل گوئی کا عہدِ زریں ہے۔ اس وقت غزل میں نکھار پیدا ہو رہا تھا خارجیت اور داخلیت سموئی جارہی تھی، صنائع لفظی کم ہو رہے تھے اور فارسی کی ترکیبیں، حُسنِ معنی کو بڑھا رہی تھیں۔ دہلی میں مومن کے رشک آمیز سوز اور غالب کے شوخ و ذہین تعشق نے پیکرِ الفاظ میں روح پھونک دی تھی۔ لیکن لکھنؤ کا ماحولِ بدمستی اور ہنگامۂ ناؤ نوش صبا و وزیر ہی کی تخلیق کرسکتا تھا۔ انسان شاید دو ہی اجزا سے مرکب ہے۔ ایک زندگی کا ارادہ، دوسرا بندگی کا جذبہ۔ زوال و انحطاط کے زمانہ میں، زندگی کا ارادہ "گرمیِ محفل" میں صرف ہوتا ہے اور بندگی کا جذبہ معاشرتی اور ذہنی اصنام کی پرستش میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں شاعری نے جامۂ عریانی اختیار کرلیا بے پردہ مضامین، تصنع، نسوانیت، مبتذل الفاظ، سوقیانہ محاورے اور انگیا چوٹی کا ذکر شعر و سخن کی جان ہوگیا۔ یوں سمجھئے کہ انشا، اور اُن کے ساتھیوں نے جو کام شروع کیا تھا، وہ مکمل ہوگیا اور "اختر پیا" کی فضا نے اس رنگ کو ایسا اُچھالا کہ بقول شخصے ہولی کا سوانگ اور گنواروں کی کبیر مات ہوگئی۔ لیکن وقت کی یہ عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔ قدرت نے اسی زمانہ میں انیس و دبیر کو بھی پیدا کیا جن کے شعری کارنامے اُردو کے لئے باعثِ فخر ہیں۔

متاخرین کے دورِ دوم میں لکھنؤ کی شاعری پر ناسخی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ امیر نے اُسے خوشنما بنا دیا۔ لیکن جذبات کا نازک تجزیہ یہاں بھی زیادہ نہ ہوسکا۔ جلال نے البتہ لکھنوی لباس میں دہلی کے حسنِ معنی کو پیش کیا۔ اور اس طرح غزلِ جدید کے لئے راہ کھول دی۔ دہلی میں داغ نے بالکل نیا تغزل شروع کیا جو نہ صحیح معنوں میں لکھنوی ہی ہے اور نہ دہلوی۔ اس میں دہلی کا سوز و گداز نہیں ہے لیکن جذبات ہیں۔ لکھنؤ کا سا تصنع نہیں ہے لیکن ابتذال ہے۔ شوخی و شیرینی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔

ریاض خیر آبادی (مرحوم) نے اِس عجیب و غریب شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور اُن کی شاعری میں وہ تمام محاسن و معائب موجود ہیں جو عام طور پر اسی دورِ سخن سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

ریاض پہلے اسیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے جو واجد علی شاہ کے مصاحب خاص اور بڑے مشاق اور پرگو شاعر تھے۔ اُنکی وفات کے بعد وہ امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے۔ امیر کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لئے مخصوص ہیں لیکن قادر الکلامی، تصوف کی چاشنی، بلند پردازی، شگفتگی اور روانی بھی اُن کے یہاں بدرجۂ احسن موجود ہے۔ ریاض نے یہ قدامت گزیں شاعری گویا ورثتاً حاصل کی اور اسی میں اپنے کمال کے جوہر دکھلائے۔

ریاض کی "مے خوارانہ شاعری" دُنیائے اُردو میں بڑی لطف انگیز اور مسرت خیز چیز ہے۔ فارسی کی تقلید میں رندی و شراب نوشی کا تذکرہ قدما نے بھی کیا ہے لیکن ریاض کے یہاں مسرت زا گداز و شیرینی سب سے زیادہ ہے۔ اُن کی زندگی بڑی پریشانیوں میں گزری لیکن وہ طبعاً نشاط پسند تھے اس لئے انھوں نے اپنی شاعری اور حسن کاری سے عیش و خرمی کی ایک دنیا بنائی۔ اسی میں زندہ رہے اور اسی میں مرے۔ وہ دراصل ابیقورین فلسفہ کے مظہر اور اس عہد کی یادگار تھے جب اودھ کی زندگی کا مفہوم باوجود تباہی اور بربادی کے صرف مسرت و نشاط کا حصول تھا۔

ریاض کی شاعری بالکل تقلیدی اور روایتی ہے۔ وہی شیخ و زاہد، ہجر و وصال، مے و معشوق اور کنگھی چوٹی کے بندھے ٹکے مضامین جن کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی شاعری میں "بوئے یاسمن" ہے اور ریاض اپنے فن کا اُستاد اور اِس دورِ خزاں دیدہ کا آخری گل خنداں ہے۔ اس کی دلکشی کا راز، اس کی رنگینی اور شوخی میں پوشیدہ ہے اور یہ رنگینی اور شوخی، وہ طبیعت کے زور اور الفاظ کے طلسم سے پیدا کرتا ہے۔ (Degas) کا ایک لطیفہ مشہور ہے کہ وہ مصوری کے دوران میں سانٹ لکھا کرتا تھا۔ ایک روز اس سے ایک شعر بھی نہ کہا گیا درانحالیکہ اس کے دماغ میں نہایت عمدہ خیالات چکر لگا رہے تھے۔ وہ بھاگا ہوا اپنے دوست ملارمے کے پاس گیا اور کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کیا بات ہے۔ میرے دماغ میں نہایت لطیف خیالات کا ہجوم ہے لیکن ایک شعر بھی موزوں نہیں ہوتا۔ شاید میرے الہام کی جوئے رواں خشک ہوگئی ہے۔ ملارمے نے کہا "میرے عزیز دوست، شاعری خیالات سے نہیں، لفظوں سے کیجاتی ہے"۔ میں جب ریاض کے کلام کا مطالعہ کرتا ہوں تو یہ لطیفہ بے اختیار یاد آجاتا ہے

حصے میں آگئی ہے جناب ریاض کے ‏ پاکیزگی زباں کی، ادائے بیاں کے ساتھ

ریاض نے دنیا کی تلخیوں سے بھاگ کر ایک خیالی دنیا میں پناہ لی۔ اس کی طبیعت میں شوخی اور چلبلاپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ باوجود شراب نہ پینے کے رند میخوار نظر آتا ہے:

ہے ریاض اِک جوانِ مست خرام ‏ نہ پئے اور جھومتا جائے،

اور باوجود پارسائی و پاکبازی کے، وہ صرفِ نگاہ کے لئے بیتاب دکھائی دیتا ہے:

جب دیکھئے تو ہے مے و معشوق پر نگاہ ‏ بااین ہمہ ریاض بڑے پارسا بھی ہیں،

اور باوجود ضعیفی و پیرانہ سالی کے سراپا شباب معلوم ہوتا ہے:

وہی شباب کی باتیں وہی شباب کا رنگ ‏ تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

اِس ماحول اور اس کردار نے مل کر ریاض کی شاعری کو گلکدۂ کشمیر بنا دیا ہے۔ وہ ناز و ادا، کرشمہ و غمزہ، معاملہ بندی اور لطفِ وصال کی عام پسند باتیں اِسی جوش کے ساتھ الاپتا ہے کہ سننے والا مست اور بیخود ہو جاتا ہے۔ وہ شگفتہ مضامین کا نقاش اور انبساطی کیفیات کا حقیقی ترجمان ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ رنج والم کی داستان بھی اس شوخی اور ملاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ انقباض سے زیادہ سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ طنز و استہزا اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ واعظ اور زاہد پر اُس کی چوٹیں دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتی ہیں۔ چسٹرٹن نے لکھا ہے کہ ایک اندھے کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خدا نے خود اُس کو بنایا ہے، طنز یا تضحیک ہے۔ اس آئینہ میں واعظ اور شیخ کے خط و خال ملاحظہ فرمایئے:

جنابِ شیخ نے جب پی تو منھ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ، بو بھی خوشگوار نہیں

سرِ بزم واعظ سے دبنا پڑا
وہ خم سے سوا تھا تن و توش میں

بوتل جب اس کے حجرے میں بھولے بھری ملی
واعظ بھی آدمی ہے بڑے اعتبار کا

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہدِ شب زندہ دار کا

خم سے نہ ہو وہ سیر، میں چُلّو میں سیر ہوں
یہ ظرف شیخ کا ہے، یہ مجھ خاکسار کا

پارسا بن کے ریاضؔ آئے ہیں میخانے میں
آپ بیٹھے ہیں بچائے ہوئے دامن کیسا

چن چن کے آج شیخ نے انگور کھا لئے
اب کیا کھنچیگی تاک کا حاصل نکل گیا

جام چھلکانے لگے بھر کے سُبوئے کوثر سے آپ
حضرت واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی
ہم رند سُن کے قلقلِ مینا کہیں جسے

دور پہونچے ہیں وہ جنت کی ہوائیں کھا کر
آج واعظ نہیں منبر سے اُترنے والے

رکھیں خمِ آتشِ سیال کے مسجد میں ریاضؔ
ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے ٹھٹھرنے والے

مینا کی طرح جا کے ابھی سر جھکائیں ہم
پیرِ مغاں سا قبلۂ حاجات بھی تو ہو

محفلِ وعظ میں بیٹھا سرِ منبر واعظ
لا کے خم کوئی بٹھا دے نہ سرِ خم مجھ کو

ارے واعظ کہاں کا لامکاں، عرشِ بریں کیسا
جو تھی ہوتی جو کچھ تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی
وہ سر پر لئے حوضِ کوثر نہ نکلے

تھیکرے نے ہجو پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ طنز نگار زندگی پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے اور مکر و فریب، رعونت و نخوت اور حق و باطل کے خلاف اس طرح جہاد کرتا ہے کہ بالآخر ہمارے جذباتِ مرحمت و محبت یا نفرت و حقارت کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم مظلوم کے ساتھ ہمدردی محسوس کرنے لگتے ہیں اور جابر و ظالم کو نفرت اور ملامت کے قابل ٹھہراتے ہیں۔ اِن خیالات کی روشنی میں اِن اشعار پر اک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ان سے وہ زخمِ تیغ پیدا ہوتا ہے یا نہیں جس کو کہ "دل کشا" کہا جائے

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

اپنی نگاہِ ناز سے برہم ہیں آپ کیوں　　کہئے تو کیا ہوا، کوئی ناوک خطا ہوا ؟
تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو　　یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری
صدقہ ادائے ناز کے قاتل نے بعد ذبح　　دیکھا جو مڑ کے جان سی بسمل میں آگئی
تمہارے کوچہ میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں　　ذرا تم آ کے لبِ بام مسکرا دینا
گلا بیٹھا ہوا، خدمت اذاں کی اور کعبہ میں　　بھلے کو ہم دبا لائے تھے ناقوسِ برہمن کو
اچھوتے جام ہیں منت کے کچھ الگ رکھے　　کسے بلائیں کوئی پارسا نہیں ملتا
تم ذرا حشر میں الگ سن لو　　مجھے کہنا ہے آج کچھ تم سے
کسے بتائیے کہ خونِ آرزو کیا ہے　　انھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہو
روشن کیئے چراغ لحدِ لالہ زار نے　　اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے

ریاض کے طعن و تشنیع میں زہرناکی اور کینہ پروری نہیں ہے اس لئے کہ خود ع

بدخواہ وہ کسی کا، نہ دشمن کسی کا تھا　　(ریاض)

اس کے یہاں ڈرائیڈن کی سی کشادہ قلبی ہے لیکن اس کی سی تہ در تہ بات نہیں ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس کے اوپر کوئی سطحی ہونے کا الزام لگائے۔ اس کا مذاق و مزاح کوئی غایتی میلان نہیں رکھتا بلکہ وہ آپ اپنی غایت ہے۔ اس کے یہاں خوشگوار شوخیاں اور اچٹتی ہوئی چوٹیں ہیں جن میں نہ آتش بیانی ہے اور نہ شعلہ سامانی۔ لیکن اُن میں ایک ایسا لطف پوشیدہ ہے جو نسیمِ سحر یا جوئبار کی سبک خرامی میں ہوتا ہے۔

ریاض کی سنجیدہ ظرافت اور شگفتہ متانت کبھی کبھی محاکات کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور یہ ایسی خصوصیت ہے جو دوسری جگہ کمیاب ہے۔ یہ شعر دیکھئے

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے　　اسے میں قربان، مرا عہدِ شباب آتا ہے

یہ رعنائی خیال بھی ملاحظہ ہو۔ محاکات کی ایسی دلکشی بھی شاید ہی کہیں مل سکے:

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی　　تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی
آنچل ڈھلا رہا مرے مستِ شباب کا　　اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے
اُن کے آنچل میں ادا بن کر قیامت چھپ چلی　　وہ مری جانی ہوئی، وہ مری پہچانی ہوئی،

یہ ادا بھی داد طلب ہے ؎

آتے آتے ترے لب تک وہ تبسم بن جائے　　اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

ذیل کے شعر میں نہایت نازک اور پُر درد کیفیات کی مرقع کاری کی گئی ہے لیکن اندازِ بیان برجستگی اور شگفتگی سے خالی نہیں ہے:

دمِ آخر ہے اُلجھن بڑھ رہی ہے اور اُلجھن پر　　یہ نازک وقت ہے، تم بال بکھرائے کہاں آئے
چھپ سے ہیں کچھ مری آغوش میں وہ حشر کے دن　　یہ ڈری ہیں جنھیں پیمانِ وفا یاد نہیں

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض   اک حسین ہر وقت ہو اُن کے منانے کے لئے

موجودہ دور میں مبالغہ نگاری کو ایک عیب خیال کیا جاتا ہے اور وہ درحقیقت ایک عیب ہے۔ لیکن طنز اور ظرافت کے مضامین میں بالخصوص اگر آنکھوں میں سرمے اور چہرہ پر غازے کے بقدر رنگ آمیزی کر دیجائے تو وہ مستحسن ہے۔ سوداؔ کے یہاں جدتِ فکر کے ساتھ غلو ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے وہ چیز بری نہیں معلوم ہوتی۔ مثلاً ہجو اسپ اور ہجو فیل میں یہ بات گراں نہیں گزرتی۔ ریاضؔ کا میدان اور موضوع سوداؔ سے مختلف ہے اول الذکر جب غزل میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں تو وہ چیز بالکل سوقیانہ اور مبتذل ہو جاتی ہے اور شعر کی ساری روحانیت اور پرکاری خاک میں ملجاتی ہے لیکن ان سنگ ریزوں میں جواہر ریزے بھی ملتے ہیں۔ جراتؔ کی طرح جب ریاضؔ کے اشعار میں خارجیت نکھر جاتی ہے اور اس میں داخلیت کا میل ہو جاتا ہے تو معاملہ بندی اور لکھنوی شاعری کا اعجاز نظر آنے لگتا ہے۔ بہرکیف اشعار ذیل کی بدمستی اور برہنگی بھی ملاحظہ ہو جو شاید خالی از لطف نہیں ہے :۔

نشہ سے جھکی پڑتی تھیں یوں ہی تری آنکھیں   چھیڑوں سے مری اور بڑھا بوجھ حیا کا
مال ہاتھوں نے لیا، ہونٹوں نے افشاں چُن لی   آکے قابو میں لٹا آپ کا جوبن کیسا
آفت ہیں کم سنی کی ادائیں شبِ وصال   کیسے وہ خوش ہیں ہاتھ سے میرے چھڑا کے ہاتھ

شعر ملاحظہ ہو ؎

کوئی منھ چوم لے گا اس "نہیں" پر   شکن رہ جائے گی یوں ہی جبیں پر
اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے   جب چھم سے چلیں، گود میں چُپکے سے اُٹھالے
باہم شبِ وصال اُٹھائے ہیں کیا کیا مزے   وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو
آڑی ہیکل کو چوم لے گی ،   وہ چیز جو کچھ اُٹھی اُٹھی ہے
یہ گوارا ہے کہ مرادستِ تمنا باندھے   اپنے محرم کو نہ کس کر کوئی اتنا باندھے
سمجھتے ہیں چھپ جائیں گے راز شب کے   وہ جوڑا جو پچھلے پہر باندھتے ہیں ،
ہم بھی پیئیں، تمھیں بھی پلائیں تمام رات   جاگیں تمام رات، جگائیں تمام رات
اُن کی جفائیں یاد دلائیں تمام رات   وہ دن بھی ہو کہ اُن کو ستائیں تمام رات

ریاضؔ نے ان اشعار کے نقل کرنے کی وجہ جواز خود پیش کی ہے :

ریاضؔ اِن میں بھی کوئی بات اچھی ہوگی   برے شعر جو درج دیوان کئے ہیں،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاضؔ کی شگفتہ بیانی کی شہرت اِن اشعار پر قائم نہیں ہے جو سراپا بیباکی و عریانی ہیں یا جن میں عام پسندی اور ابتذال کا عنصر نمایاں ہے بلکہ اس کی شہرت اُن اشعار پر قایم ہے جو بے ساختگی اور لطیف طنز کے حامل ہیں۔ جن میں ایسی ظرافت پائی جاتی ہے جن کا تعلق زبان اور بیان کی رنگینیوں سے ہے اور جن میں ع

شوخی میں بھی جاتا نہیں انداز حیا کا !   (ریاضؔ)

یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ بیٹھے ریاضؔ آج تو کچھ جھوم رہے ہیں　　اب یہ بھی گنے جاتے ہیں مردانِ خدا میں
وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشوں کے ہمراہ　　آج جنت میں ہمیں ناصح مغفور ملے
شراب پیتے ہی مسجد میں ہم کو گرنا تھا　　یہ شغل بیٹھ کے اچھا تھا، قبلہ رو کرتے
بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن　　ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں،
تا میکدہ ریاضؔ کا جانا محال تھا　　کس طرح یہ بزرگ خمیدہ کمر گئے
جامِ مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن　　سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
کیسے یہ بادہ خوار ہیں سُن سُن کے پی گئے　　واعظ کو کچھ مزہ نہ کسی نے چکھا دیا
بری کیا تھی فاقہ مستی بڑے لطف سے گزرتی　　لئے کچھ جو مے کی تلخی، غمِ روزگار ہوتا
دستِ شفقت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاضؔ　　بیٹھ کر یادِ خدا میں جھومنا جاتا رہا

ریاضؔ دورِ آخر کے شاعر ہیں۔ اِس وقت لوگ اپنی تباہ و برباد زندگی کو پُرانی وضع کے ساتھ ہنس بول کر گزار دینا چاہتے تھے۔ ریاضؔ بھی اسی ماحول کے فرد تھے۔ اُن کے اوپر قدرت نے یہ اور نوازش کی تھی کہ اُن کو طبعاً نشاط پسند اور زندہ دل بنایا تھا، بذلہ سنجی اُن کے مزاج کا خمیر تھی۔ وہ نہایت با وضع، خندہ رو، کشادہ جبیں، اور باغ و بہار آدمی تھے۔ محفل اور انجمن کی رونق، اُن کی موجودگی سے بڑھ جاتی تھی۔ خود کہتے ہیں:

جس انجمن میں بیٹھ گیا، رونق آ گئی،　　کچھ آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری، خوش طبعی، زندہ دلی، رندانہ شوخی اور حُسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ کا مرقع ہے جہاں زبان کی لطافت نے شوخی و رندی کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ وہاں کلام میں وہ تیزی اور نشتریت پیدا ہو گئی ہے جو طنز و ظرافت کی جان ہے۔ اور یہی اُن کے تاجِ کمال کا طرہ ہے۔ اسی قسم کے اشعار میں جوانی اور رندی کی گرمی دھیمی اور ہلکی ہو کر فضائے ماہتاب کی طرح خوشگوار ہو گئی ہے اور در اصل یہی وہ حصۂ کلام ہے جو ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں سرور و انبساط کی کیفیت پیدا کرتا رہے گا۔

خواجہ احمد فاروقی - ایم - اے

"نگار" کے مجلد پرچے

سنہ ۲۶ء سے سنہ ۳۶ء تک کے ہمارے پاس موجود ہیں اور ہر چھ مہینے کی ایک جلد کی قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے ہے۔ پرچے علحدہ علحدہ نہیں مل سکتے بلکہ پوری جلد مل سکتی ہے۔

مظہر علی - قاضی ٹولہ - بدایوں

مکاتیب ریاض

حضرت دل شاہجہانپوری کے نام

مکرمی - دو صفحوں سے بہ ترمیم و بلا ترمیم آپ جو کچھ چاہیں اپنے کام میں لا سکتے ہیں - میرے الفاظ ذیل آپ کے اتفاق اور اختلاف کے محتاج ہیں - وہ بھی صرف میرے آپ کی آگاہی کے لئے -

ہے پرے[1] سرحد ادراک سے اپنا مسجود

یہ مصرع کبھی میری نظر سے گزرا ہے - میں پرے کے لفظ کو متروک سمجھتا ہوں - داغ - امیر - جلال نے بھی استعمال نہیں نہ ان کے متبعین نے - عام بول چال میں بھی نہیں - بعض دلی والے شاید بولتے ہوں

دور ہے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

پرے کا استعمال بے وجہ ہوا ہے - ممکن ہے بہت پرانی غزل منشی صاحب کی دیکھی ہوئی ہو اس صورت میں نوٹ دیدینا ضروری تھا - میں نے بے تکلفانہ اپنا خیال ظاہر کر دیا - نہ جواب کی ضرورت ہے نہ بحث کی -

(۲) اب تو ہر ہر نفس سرد ہے افسانۂ دل - ہر ہر کا لفظ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا

(۳) کہ ایک وقت میں ہم ترک آرزو کرتے - اسکے لئے (ایک وقت میں) کیسا - اسوقت ضرورت میری سمجھ میں نہ آئی - آئندہ شاید سمجھ میں آجائے

(۴) اُٹھتے تو محو تمنا ملے تو غرق نیاز - عزیز نے بھی انتخاب میں لیا - میرے خیال میں غرق کا لفظ باعتبار مناسبت کوئی رعایتی لفظ چاہتا ہے - جیسے غرق بحر اُلفت یا آب خجالت -

دیوان میں جب کوئی بات قابل استفسار نظر آئے گی آپ سے دریافت کروں گا - نیاز نے مقدمہ میں بے ضرورت داغ کا یہ شعر لکھکر

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور کیا چیز حرام ہوگئی ہے

داغ کو میخوار ظاہر کیا ہے اور فوری ثبوت بھی اسی شعر سے دیدیا ہے یہ بھی اشارہ فرماکر کہ پینے والے کو زیادہ مزا دیتا ہے - اپنی نسبت بھی لوگوں کو بدگمانی کا موقع دیدیا ہے - آپ کو صاف صاف دامن آلودہ نہیں کیا غنیمت ہے - مجھسے نیاز سے بہت یکجائی رہی - میں نے کبھی پیتے نہیں دیکھا نہ ایسی حالت میں کہ شبہ کر سکوں مگر مجھسے تو بحث داغ سے ہے - کیا داغ کے پینے نہ پینے کی نسبت آپ کچھ کہہ سکتے ہیں - یہ غیر ضروری باتیں اس وقت میرے قلم سے نکل گئیں - میں خود نیاز سے کبھی پوچھ لوں گا میں نے آپ کا وقت ضایع کیا - معاف کیجئے، اور اپنا ہوا خواہ اور دعاگو سمجھئے - اب لکھنے پڑھنے سے معذور ہوتا جاتا ہوں اور ساتھ ہی

کچھ اپنے حال کا مجھے احساس ہی نہیں یہ میں ہوں پیرہن میں کہ مردہ کفن میں ہے

---

[1] اس مصرع میں جناب ریاض کو میری تصنیف کا شبہ ہوا تھا - جو بعد کو رفع ہوگیا -

میرا دست مرتعش نہ دل شکنی روا رکھ سکتا ہے نہ کچھ لکھ سکتا ہے - آپ کی کہنہ مشقی اور خدائے سخن اثیر کے ساتھ امتیازی خصوصیت مقدمہ اور تبصرہ دیوان کی محتاج نہ تھی مگر ظلم تھا اگر مقدمے اور تبصرے سے نیاز و عزیز آپ کی قدر افزائی نہ فرماتے۔ عزیز صاحب کی کم نگاری جن اسباب سے ہو سحر طراز مدیر نگار سے دوش بدوش ہے۔ میں اس لئے دونوں حضرات کا شکر گزار ہوں کہ میرے پہلو نشین حضرت دل کا معاملہ ہے۔ مجھ میں دل میں اتنا فرق ہے کہ میرا مجموعۂ کلام ابتذال سے خالی نہیں اور ان کا کلام اس سے پاک ہے اور جس کی تمام خصوصیتیں مقدمے اور تبصرے میں نہایت حسن سے ظاہر کردی گئی ہیں۔ کتابت طباعت - کاغذ اس کے سوا تمام مجموعۂ کلام جاذب و نظر فریب ہے، انگریزی مذاق بہ اعتبار تعلیم شاید حرف گیری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے مگر سحر نگار نیاز کے مقدمے اور جناب عزیز کے تبصرے نے دیوان کو اس سے بھی بے نیاز کر دیا ہے مذاق کی پاکیزگی، زبان کی پاکیزگی۔ حسن بیان اور سحر بیان۔ معنیٰ آفرینی۔ جدت طرازی سب کچھ اس مجموعہ میں ہے۔ وہ اچھوتی چیز بھی چھوٹی نہیں جس کے مجھے نیاز نے نئے انداز سے مقدمہ میں انگشت نما کیا، وہ انگشت جس پر لب ساغر کی لالہ گوں جھلک ہے۔ حنائی نہیں۔ میں سرخی حنا کا طالب تھا

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

حضرت نیاز فتحپوری کے نام

شوخ نگار مدیر نگار پیارے نیاز میرے لئے سرمایۂ ناز - پرسوں نگار آیا۔ مجھے فوراً بھولا ہوا زمانہ یاد آیا اور میں تعمیل ارشاد میں مصروف ہوا جاڑوں کی لمبی راتیں کام آئیں اور میں یہ کہنے کے قابل ہوا

سپردم بتو نامہ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

ناتمام مراسلہ بھیج رہا ہوں - بد قسمت بھی ہوں - بد خط بھی۔ مجھ سے اپنا لکھا خود نہیں پڑھا جاتا۔ حروف نہیں تحریر قسمت کی آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔ خدا کرے آپ پڑھ لیں۔ نقل کے لئے وقت کافی نہیں۔ آپ میرا یہ مراسلہ مجھے واپس دینے کو باحتیاط رکھ لیں۔ جواب کی ضرورت نہیں میں غالباً جلد اس لئے آؤں گا کہ ہلال صیام بنکر میں زار و ناتواں خیر آباد واپس آجاؤں۔ ماہ مبارک کا آغاز لکھنؤ میں نہ ہونے پائے۔ بھوک کا مزا گھر پر لطف دیتا ہے ؎ ریاضؔ

مرے ہوئے پڑے رہتے ہیں رات دن گویا
ہماری عمر میں شاید مہ صیام نہیں

روزہ داروں کی رات مزے کی ہوتی ہے۔ میں نے خود کہا ہے ؎

روزے نہیں ہیں سخت یہ سب باتیں ہیں،　　　ہاں لطف فزا شب کی ملاقاتیں ہیں
یاروں میں مہ صوم کی تعریف یہ ہے　　　کچھ ہجر کے دن وصل کی کچھ راتیں ہیں

مگر مجھ سے مفلس گرسنہ کے لئے رات دن برابر۔ مرے ہوئے پڑے رہنا اچھا، کہ مہ صیام شمار عمر میں نہ رہے۔ بچوں کو دعا۔ گھر میں مزاج پرسی -

ریاضؔ　　　۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء

نیاز صاحب - آپ میری تصویر کو بڑھاپے میں روشناس خلق یا رسوائے عالم کرنا چاہتے ہیں ؎

میں پھر اس در سے تو خلقت تماشائی ہوئی　　　آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

میں خود اپنی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا اوروں کی نسبت کیا عرض کروں وہ دن گئے ؎

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر — کس وضع کا جوان ہے کس آن بان کا

یہ کہنے کا موقعہ کہاں ؎

تم جوانی کے مزے لوٹو ریاضؔ — عیب بھی زیبا ہے اس سن کے لئے

اب تو میرے لئے ہر ایک کو مجبوراً یہ کہنا پڑے گا ؎

جنّت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا

گو بڑھاپے کی بڑھتی ہوئی ہوس اس عمر میں بھی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے ؎

دے پیرِ مغاں دخترِ رز عمر رسیدہ — بوڑھا ہوں ملے نور نظر چرخ کہن کی

وہ زمانہ بھی غنیمت تھا - جب دھوپ چھاں یا نیم سپید ریش کسی کے دست حنائی سے رنگ حنا کی خواستگار ہوتی تھی اور کسی موقع پر خان بہادر سید احمد حسین رضوی لکھنوی سے یہ سننا پڑا تھا ؎

حنا لگا کے پہونچتے ہیں گلرخوں میں ریاضؔ — کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یا خداوند نعمت حضور مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ والی محمود آباد اودھ - صورت دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کرتے تھے ؎

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن — ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

خود بھی رنگینی خضاب کے اسباب فراہم کرکے شوقِ خضاب میں کہنا پڑتا تھا ؎

خوب ہیں سشاہدان بازاری ، — ہم سیہ کار وہ خضاب فروش

دیکھئے کالا منھ کرنے کے محاورے کو کس حسن سے ادا کیا ہے - ایسے ابتذال پر غیر متبذل صدہا شعر صدقے آپ بھی غالباً قدر کریں گے گو باعتبار ریش ، گوری کالی یعنی سیاہ و سفید دونوں سے آپ بے نیاز ہیں -

کالی گوری کے متبذل استعمال نے اس وقت ایک شعر بے محل اور ریش سے غیر متعلق یاد دلوایا - شاید اُتری جوانی اور ریش آہن کردہ سے گونہ دور کا تعلق ہو آپ جبیں پر بل ڈالکر بادل ناخواستہ وہ میرا متبذل شعر بھی سُن لیجئے مگر کوشش فرمایئے گا کہ میرے قدرداں مہربان مولوی عبدالسلام صاحب ندوی مولف شعر الہند تک نہ پہونچنے پائے ؎

کالی گوری کوئی نہ چھوٹی ، — افیوں کھا کر پی لی - توبہ

آپ اُس زمانہ میں تصویر شایع کر رہے ہیں - جب ریش سفید پر کوئی رنگ ہی نہیں چڑھتا نہ ساون کی مہندی کام دیتی ہے نہ کسی شوخ کے لب نازک سے شراب کی کلیاں -

اب ریش سفید نے دراز عمر شیخوخیت سے زیادہ اعتبار پیدا کر لیا ہے -

کبھی کبھی " دراں بچہ دہد خر گوشے " بھی سُن لینا پڑا ہے مگر قصر نماز کی طرح قصر ریش کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی -

اب تو بہ اعتبار ریش و بروت یہ کہنے کے بھی قابل نہیں ہوں ؎

تشنہ تھا مرا شباب پی لی — بھیگیں جو مسیں شراب پی لی

یہ وہی زمانہ ہے کہ بغیر شراب کے مسیں بھیگ رہی تھیں -

حضرت نیاز کا مضمون "دکن کی دلنواز شام" دیکھ کر

محترمی - نگارِ آتشیں آیا مگر سادہ لوح بنکر، صورت پکار اُٹھی پردہٗ زنگاری میں جلوہ گر رہنے والا آگیا

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

دکن کے متعلق جو کچھ لکھا اور جس طرح لکھا آپ کا حصہ ہے، ادائے بیان پر یہ خداداد قدرت کسی سحر نگار کے بس کی بات نہیں "سرزمین دکن کی ایک دلنواز" یہ عنوان یہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا، نہ شام کی ضرورت تھی نہ شب کی۔ مجھ حسرت نصیب کو اپنا ایک شعر یاد آگیا ؎

وہ رات مزے کی ہے جو ہو بات مزے کی کلکتہ میں گزری نہ کوئی رات مزے کی

کاش آپ کے ساتھ دکن ہی میں ایک رات ایسی نصیب ہو جاتی۔ پیریٔ شباب سے بدل جاتی۔ ایک بوتل میں سب کچھ ہو سکتا تھا۔

یہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

جس دلنواز کا ذکر ہے اسے ہمارا حصہ ہونا چاہئے تھا سامعہ نوازی کے لئے بھی دلنوازی کے لئے بھی ایک حد تک نگار نے تصویر کھینچ دی اسکی ضرورت نہ رہی کہ ؎ ہماری آنکھوں میں آؤ تو ہم دکھائیں تمہیں ادا تمہاری جو تم بھی کہو کہ ہاں کچھ ہے

ادائے بیان کی محویت نے تصور ہی میں سب سامان یارانِ دور افتادہ کے لئے مہیا کر دیا اور یہ کہنے کا موقع نہ رہا:

بھر بھر کے جام بزم میں چھلکائے جاتے ہیں ہم ان میں ہیں جو دور سے ترسائے جاتے ہیں

حضور مدار المہام کا لطفِ صحبت بھی خزاں دیدہ ریاض کو انگاروں پر لٹا دینے والا ہے، جوانی کی طرح وہ راتیں بھی یاد آگئیں جب مہاراجہ بالقابہ صدر اعظم کے دولتکدہ پر آنجہانی سرشار کو مہاں نوازی کی خدمت سپرد تھی، دکن میں آپ نے ہماری جگہ لی اور سرشار کی جگہ ہوش نے۔ ہوش کا نام لیتے ہی داغ کا یہ شعر یاد آگیا ؎ پھر دل قابو میں نہ میرا دلِ ناشاد آیا وہ میرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا

میں لکھنؤ گیا آپ دکن میں تھے امتیاز صاحب جیل میں، میں دونوں کے پاس تھا مگر بظاہر شباب رفتہ کی طرح دور۔ یہ بھی سُن لیجئے کس ماحول میں کس طرح میری زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ماہ مبارک کے آغاز میں کہا تھا ؎

بن کے جہاں ایک رند روزہ دار آنے کو ہے شام ہونے کو ہے میرے گھر اُدھار آنے کو ہے

میں خوش ہوں آپ دکن سے خوش آئے۔ مجھے بھی خوش رکھئے مگر میں کیا خوش رہ سکتا ہوں جب امتیاز جیل میں ہیں۔ گھر میں اور بچوں کو دعا کہئے، آسی کو بہت بہت سلام۔ جلد آکر ملوں گا۔

جناب میر ناصر علی اڈیٹر "صلائے عام" دہلی کے نام

اقلیم سخن میں دو شخص ہیں ان دو میں ایک "ناصر" اس کا نمبر دوسرے سے بڑھا ہے چاہتا ہوں دوسرے کو جلد سے جلد موت آئے اور اس کی عمر کا حصہ ناصر کو مل جائے۔ ناصر سے بہتر نثر لکھنے والا نہیں گزرا جو بات ناصر ادا کر رہا ہے اسی کا حصہ ہے۔

شعر کا سرتاج غالب پرانے زمانہ کا آدمی تھا اس کو کچھ نسبت نہیں، اچھے سے اچھا فارسی کا شاعر پرانا ہو یا نیا یورپ کا عمدہ سے عمدہ مضمون آفرین لٹریچر پر سخت حکومت کرنے والا ناصر کی تقلید نہیں کر سکتا۔ حسد اور رشک کا تقاضہ یہ ہے کہ میں ناصر کو برا کہوں۔ ہاں آپ میرے کسی فقرے کو صلائے عام کی ڈاک میں نہ چھاپ دیجئے گا کہ مجھے تردید کی ضرورت پیش آئے۔

جناب شاہ نظام الدین دلگیر اڈیٹر نقاد آگرہ کے نام

کل میں لکھنؤ آیا تو آپ کے دو کارڈ ملے۔ میں جب آگرہ گیا تھا تو خوش تھا کہ آپ سے ملوں گا افسوس آپ موجود نہ تھے۔ میں اسوقت بھی مردہ تھا جب آپ مجھ سے ملے تھے اور اب تو بوسیدہ ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں البتہ اس اعتبار سے بہت اچھا ہوں ؎

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

آپ مجھ کو اپنی دلی محبت سے آفتاب سخن بناکر نمایاں کرنا چاہتے ہیں، میں وہ داغ دل ہوں جو کبھی نمایاں ہو نہیں سکتا دعا کیجئے کہ قبر سے اپنا مصرع پڑھتا نکلوں ؎ ہم گنہگار بھی اللہ کے پیارے نکلے

بہ تعمیل ارشاد ایک غزل بھیجتا ہوں جو داغ کی مشہور زمین میں ہے ابتک میں نے اسے چھپائے رکھا تھا۔

جناب احسن مارہروی کے نام

مکرمی۔ دیوانہ بنانے والے الفاظ آپ کے محبت نامہ میں میری نظر سے گزرے۔ میں تو خود کو احسن کا زرخرید سمجھتا ہوں۔ دیوانہ بنائیں فرزانہ بنائیں ہر طرح بنائیں۔ چشم ماروشن دل ماشاد۔ مجھے شوق ہے چوری چوری آپ کی موجودگی اور دلگیر کی موجودگی کا پتہ لگاکر میں کسی نہ کسی طرح مارہرہ پہونچ جاؤں اور یہ شعر سناؤں ؎ یار کے بند قبا آہستہ وا کرنے کو تھے چوری چوری کچھ نہ پوچھو رات کیا کرنے کو تھے

یہاں تک لکھکر میں نے مطبوعہ دعوت نامہ دیکھا اس میں ۵ راگست تحریر ہے۔ ۵ راگست تو سر پر آگئی مجھے کم سے کم بیس روز کی فرصت درکار ہو۔ بہر حال انتہائی کوشش سے کام لوں گا۔ آپ نے غلطی کی مجھے پانچ روپیہ فی شعر معاوضہ دینے کو لکھدیا ہوتا دنیا کے کام چھوڑ کر مصروف کار ہوجاتا، آئندہ کے لئے عرض شعر سہی۔ یہ استدعا نہیں کہ پیشگی محض دھوکا دینے کے لئے کہ لالچ میں پڑکر اونچ خورد بہ امداد فرزندم کے لئے غلط سہارا پاکر مصروف ہوجاؤں۔

آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے اور جب ملوں دلگیر بھی ہوں۔ دلگیر کے مزاج و مذاق سے نا آشنا ہوں، بہر حال وہ میری بزرگ داشت میں کوتاہی کبھی نہ کریں گے۔ لیکن آپ مجھے اپنا بہت مشتاق سمجھکر کہیں خیر آباد نہ تشریف لے آیئگا اس خیال سے میں ڈر گیا۔ میں ہرگز آپ کا متمنی نہیں ہوں نہ آپ سے مجھے لطف ہے۔ دنیا سازی کے برتاؤ سے ایسے فقرے لکھ دئے ہیں کہ آپ خوش ہوجائیں اور میں اس طرح آپ کو بناکر دیوانہ بنانے والے الفاظ کا بدلہ لے لوں۔

کارڈ ختم۔ مضمون ختم۔ دلگیر کے سلام کا جواب سلام۔

جناب حکیم سید انوار حسین صاحب حکیم خیر آبادی کے نام

والا برادر۔ غزل واپس بھیجتا ہوں۔ اس سخت زمین میں آپ نے بہت ہی لطف پیدا کر دیا۔ پندرہ دن سے نیاز مند جناب سید نیاز احمد صاحب نیاز مرحوم برادر حضرت ریاض) کا خط نہیں آیا۔ مجھ نیم جاں کی جان ان میں لگی ہوئی ہے۔ میرے لئے آپ تاب وتواں ہیں، دوا کل ختم ہوگئی فوراً خبر لیجئے۔

شعر حکیم ـــــــ	ہے شکستِ دل صدائے دردِ دل	آہ و نالہ ہے نوائے دردِ دل ؎
اصلاح ـــــــ		کتنی نازک ہے
شعر حکیم ـــــــ	پھل ملے فوراً محبت کا اسے	جو لگائے دل وہ پائے دردِ دل ؎
ـــــــ	سانس رکتی ہے گھٹا جاتا ہے دم	آج ٹھنڈی ہے ہوائے دردِ دل
اصلاح ـــــــ		" بگڑی
شعر حکیم ـــــــ	سانس سینے میں سماتی ہی نہیں	اور ہی اب ہے ہوائے دردِ دل ؎
ـــــــ	جیسے دل میں چٹکیاں لیتے ہیں وہ	جان لیوا ہے ادائے دردِ دل ؎
اصلاح ـــــــ		ان سے ملتی ہے
شعر حکیم ـــــــ	خاکِ دل سے درد کے پودے اُگیں	خاک میں دل کو ملائے دردِ دل ؎
اصلاح ـــــــ	در دل سے پیدا چمک ہو درد کی،	
مقطع ـــــــ	وصل ہو یا موت ہی آئے حکیم	ختم ہو یہ ہائے ہائے دردِ دل ؎

نفیس احمد جعفری

ریاضؔ

ایک بار الہ آباد یونیورسٹی کی ایک مختصر ادبی انجمن میں جب چائے کا دور چل رہا تھا میں نے حاضرین سے کہا "کوئی ایسا شعر سنائیے، جسے سُنکر آنکھوں میں آنسو آجائیں"۔ انجمن پر ایک لمحے کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔ ایک صاحب نے بس اتنا کہا "بڑا مشکل ہے"۔ یعنی ایسا شعر اچانک یاد آنا یا یاد کرنا بڑا مشکل ہے جس سے آنکھیں پُرنم ہوجائیں۔ کیا حیرت کی بات نہیں کہ جس اُردو شاعری کو لوگ رونے کی طولانی داستان بتاتے ہیں جب اُس سے رُلا دینے والے شعر مانگے جائیں تو یہ حال ہو۔ ہم آنسو مانگتے ہیں اور ملتے ہیں ہمیں رونے کے متعلق خشک الفاظ۔

کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ فطرتِ اشک بھی زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ ہر دور، ہر زمانہ کے آنسو بدلتے رہتے ہیں اور نئے انداز سے زندگی کی آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ بچّہ کسی بات پر روتا ہے، بڑے کسی اور بات پر روتے ہیں، پھر بعد کو اُس بات پر بھی نہیں رونے پاتے۔ آنسو بھی وقت پر دغا دیجاتے ہیں۔ اشعار رہ جاتے ہیں، ان کے آنسو سوکھ جاتے ہیں۔ کسی زمانہ میں فانیؔ کی "کفن سرکا ؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ" والی غزل پر آنسوؤں کی جھڑی سی لگ جایا کرتی تھی۔ اور اب ؟ اس لئے سوال یہ ہے کہ شعر میں آنسوؤں کو دیر تک شاداب رکھنے والے کون سے صفات ہیں ؟ کیا بات ہے کہ کئی صدی پُرانے اشعار کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے اور ان کے بعد والے اشعار کے آنسو سوکھ چلے ؟ میں یہ سوال پوچھ کر چُپ ہوجاتا ہوں۔

بہرحال جلد خشک ہوں یا دیر میں، آنسو پھر بھی آنسو ہیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اپنے وقت کی اُردو غزل گوئی اور عام اُردو شاعری کو آنسوؤں میں یا کم سے کم سوز و گداز کے جذبات میں ڈوبا پایا۔ عزیزؔ لکھنوی، حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ اور اصغرؔ، یگانہؔ و اقبالؔ تک کے یہاں بھی جذبات کس شدّت کے ہیں، کبھی کبھی اُن کی آواز کتنی رُکی ہوئی ہوتی ہے اور کتنی دُکھی ہوئی۔ جہاں تک جنسی یا رومانی محبّت کا تعلق ہے یہ سوال بار بار میرے دل میں پیدا ہوا کہ ناسخؔ سے لیکر ریاضؔ تک صحیح معنوں میں دل دُکھا دینے والی آوازیں اُردو شاعری میں کیوں نہیں سنائی دیتیں ؟ سوداؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی کی غزلوں کا ذکر جانے دیجئے۔ اس دور میں میرؔ، سوزؔ، دردؔ اور ان کے ہمنوا ہمیں رُلانے کے لئے کافی تھے اور ان کی بھرّائی اور تھرائی ہوئی آوازیں مصحفیؔ، انشاؔ اور جراَتؔ کے وقت میں بھی کروٹیں بدلتی رہیں۔ لیکن ناسخؔ سے ریاضؔ تک تو گویا آنسوؤں کا اُردو شاعری میں کال پڑ گیا تھا۔ مانا کہ ناسخؔ، آتشؔ، امیرؔ، داغؔ اور ریاضؔ یا تو بہت ہنس مُکھ تھے یا عشق کی المناکی سے ناآشنا، لیکن رشکؔ، تجرؔ، خلیلؔ، رندؔ، صباؔ اور صفِ دوئم کے شعرا میں کیا ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جس کو محبّت کی ناکامیوں سے واسطہ پڑا ہو اور جس کی شاعری میں ایک گھائل دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہوں۔ یہ سب شعرا اتنے ہنسوڑ کیوں ہیں۔ کیا یہ سب ساون کے اندھے تھے کہ انھیں ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہو ؟ انیسؔ اور دبیرؔ مرثیہ گو تھے لیکن وہ بھی اپنی باتیں کہتے ہوئے کھل پڑتے ہیں۔ بہار چھائی ہوئی ہے اور یہاں بھی اندر سبھا جمی ہوئی ہے :-

ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے ——— یا ——— تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

اس دور کے اخیر میں البتہ درد بھری آوازیں پھر آنا شروع ہوتی ہیں، تعشقؔ کے یہاں سے، حالیؔ کے یہاں سے، آسیؔ غازیپوری اور

شاد عظیم آبادی کے یہاں سے لیکن وہ بھی امیر، داغ اور ریاض کے قہقہوں اور چہچہوں میں گم سی ہوگئیں۔ اس لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر انسانی فطرت اور انسانی مزاج کبھی نہیں بدلتے اور عشق سراسر غم ہے تو اُردو شاعری میں حسن و عشق کی دنیا ریاض کے یہاں کیوں کچھ اور ہے اور ریاض کے بعد کے شعرا کے یہاں کچھ اور؟ خوشحالی اور بدحالی، تمول و افلاس کی بحث نہ چھیڑئے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ریاض کھاتے پیتے ہوئے آدمی تھے اس لئے بے فکرے تھے اور فانی پریشاں حال رہے اس لئے ان کا عشق بھی ناکام رہا اور انکی عشقیہ شاعری بھی پریشاں حال رہی۔ ایسی باتوں کا کوئی ایک سبب نہیں ہوا کرتا۔

ریاض کو سمجھنے کے لئے اب سے سوا سو برس پہلے کے ہندوستان کو نہیں مگر اہل اودھ کو سمجھنا ضروری ہے۔ دل ان لوگوں کے پاس بھی تھے اور شہوانی جذبات بھی۔ مگر ان کی نئی سماجی زندگی ان پر چھائی ہوئی تھی، ہر ایک کی شخصیت و انفرادیت پر نئے تکلفات، نئے رسوم و آداب مسلط تھے۔ سماج کے ساتھ افراد کی زندگی بھی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ سماج کے خارجی حرکات و سکنات داخلی زندگی پر غالب آرہے تھے اور زندگی ایک جھوٹ بن کر رہ گئی تھی۔ جذبات کا فطری اور غیر فطری ہونا مسلم لیکن جذبات کے بھی فیشن ہوتے ہیں۔ جذبات بھی کبھی کبھی صرف رسمیات ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے لوگوں کو نہ ہنسنے کی تمیز تھی نہ رونے کا سلیقہ تھا انشا اور جرأت کے وقت ہی سے یہ ہلکا پن شروع ہوگیا تھا۔ بناوٹی دماغوں کو عارضی خوشحالی کیا سنوارتی۔ اس لئے نہ ان کی خوشی خوشی تھی نہ ان کا غم غم، اور اس طرح پوری زندگی ایک غلط، وسطحی نظرئے کے نذر ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر یہاں تو کنوئیں میں بھنگ پڑی ہوئی تھی بناوٹی خوشی کے پردے میں بناوٹی غم کا سوانگ رچا جا رہا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، انحطاط و زوال کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ سو برس تک بگڑ کر بھی دلی اتنی نہیں بگڑی تھی جتنا بنا بنا ہوا لکھنؤ بگڑا۔ لکھنؤ بھر کی شاعری میں محبت کی جو ٹیس اور جلن مثنوی زہر عشق میں ہے وہ کہیں اور نہیں۔ اس مثنوی کے وصیت نامہ کے خلوص و سوز و گداز کو یادگار بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس وصیت نامہ کے لب و لہجہ پر غور کریں تو خلوص اور ہلکے پن کا عجب میل نظر آئے گا۔ اور عاشق صاحب کا زہر کھا کے مسکراتے ہوئے اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے پھر جی اُٹھنا اسوقت کی جھوٹی اور بناوٹی زندگی کی کھلی چغلی کھا رہا ہے۔ الغرض اسوقت کی نام نہادی نشاطیہ شاعری میں بھی نہ کہیں بذلہ سنجی ہے نہ حقیقی طنز۔ بدمزہ کر دینے والی مستی اور اوچھی باتوں کے سوا کچھ نہیں۔ میریڈتھ کا یہ قول سمجھنے کی چیز ہے کہ طربیہ دماغی یا مفکرانہ ہنسی ہے (Comedy is in- tellectual laughter)

یہی تھی وہ فضا جس میں اب سے سو برس پہلے ریاض نے آنکھیں کھولیں، پلے اور بڑھے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ریاض کی دنیا اور ریاض ایک دوسرے پر کس کس طرح اثر انداز ہوئے۔ میرا وطن وہی شہر گورکھپور ہے جس کی وہ گلیاں جن میں ریاض نے اپنی جوانی کھوئی تھی ریاض کو عمر بھر یاد آتی رہیں۔ یوں تو اپنی عمر کے آخری تیس برس ریاض نے کبھی لکھنؤ اور کبھی خیرآباد میں گزارے لیکن ان مقامات میں وہ مہمان کی طرح رہے اور گورکھپور چھوڑنے کے بعد بھی جب زخم کہنہ تازہ کرنے کے لئے وہ گورکھپور آجایا کرتے تھے تو ان کے چہرے کا وہ رنگ ہوتا تھا جو صبح وطن ہی پیدا کر سکتی تھی۔ اسے میری نگاہوں نے خود پہچانا ہے۔ ہاں تو گورکھپور میں ریاض الاخبار، فتنہ اور عطر فتنہ کے روح رواں ریاض، خوش باش، خوش فکر، خوش پوش اور خوش گو ریاض یوں تو ایک چھبیلے نوجوان تھے،

ہے ریاض اک جوان مست خرام
نہ پئے اور جھومتا جائے

لیکن اس محبت سے سرشار بانکے جوان کا دل دُکھا ہوا تھا یا نہیں، پتہ چلانے، جاننے اور سوچنے کی بات ہے۔ کچھ دوسرے شعرا کے عشقیہ اشعار سے ریاض کے اشعار کا مقابلہ کیجئے:

عزیز لکھنوی:-	او ناشناس جنسِ وفا میں ترے نثار	کیا سوچتا ہے خوں بھری تلوار دیکھ کر
ریاض:-	حشر ہے حشر کوئی جلوہ گہ ناز نہیں	آج کیوں مہندی لگے ہاتھ میں خنجر ہوتا
فانی:-	دشمنِ جاں تجھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے	تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
ریاض:-	نزع میں دوست سے پیمانِ وفا کرتے ہیں	اس دغاباز سے ہم آج دغا کرتے ہیں
فانی:-	بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بچھی جاتی ہیں	کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا
غالب:-	تھا دام سخت و تنگ نہاں آشیاں کے پاس	اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ریاض:-	جال اس رنگ سے گلشن میں بچھاتا صیاد	میں سرِ شاخ چلوں سایہ تو دام چلے
ریاض:-	بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی	کہ ڈھونڈھتا ہوں تو اب آشیاں نہیں ملتا
ریاض:-	چھائے پھولوں سے بھی صیاد تو آباد نہ ہو	وہ قفس کیا جو ترا دامنِ صیاد نہ ہو
اقبال:-	کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں	کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
ریاض:-	یہ اڑائیں گے کبھی رنگ بھی یہ دکھائیں گے کبھی رنگ بھی	یہی لائیں گے کبھی رنگ بھی جو رنگے ہیں رنگِ مجاز میں
آسی غازی پوری:-	میری آنکھیں اور دیدار آپ کا	یا قیامت آ گئی یا خواب ہے
داغ:-	آنکھ میں آنکھ تو ڈالی نہیں جاتی ظالم	دل میں دل ڈال دے کس طرح سے انساں کوئی
عزیز لکھنوی:-	چھپتے کیوں ہو جو سر تا بہ قدم دیکھتے ہیں	یہ کوئی اور نہیں ہے تمھیں ہم دیکھتے ہیں
ریاض:-	اے بتو تم سے اگر آنکھ چرائی ہو کبھی	حشر میں بھی مجھے اللہ کا دیدار نہ ہو
شیفتہ:-	چھیڑتے کیوں ہو مجھے جانے دو ان باتوں کو اب	تم بھلا جاتے رہو گے شیفتہ کی بات سے
ایضاً:-	ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی	تھام لینا وہ ترے محمل کا
ریاض:-	سحر ہوتے گیا کوئی تو یہ کہتے گیا کوئی	یہی تو ہیں کہ ان کے گھر کوئی پھر میہماں ہو گا
حالی:-	گھر ہے وحشت خیز اور صحرا اجاڑ	ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ
ریاض:	یہ شبستاں ہے نہ اب شمعِ شبستاں کوئی	گھر کا یہ حال ہے جیسے ہو بیاباں کوئی
غالب:-	جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا	ہاتھ کی جتنی لکیریں تھیں رگِ جاں ہو گئیں
ریاض:-	یہ سربمہر بوتلیں جو ہیں شراب کی	راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی
ریاض:-	دے دے تو میری جوانی ترے صدقے ساقی	ہے وہی تیرے چھلکتے ہوئے پیمانے میں
داغ:-	روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے	مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے
ریاض:-	مر گئے پر بھی تعلق یہ ہے میخانے سے	میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے
اصغر گونڈوی:-	رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے	جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے
ریاض:-	جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے	جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
درد:-	تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو	دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ریاض :- انھیں میخانوں میں ہیں پیرِ مغاں ایک سے ایک — کعبۂ دیں ہے کوئی قبلۂ ایماں کوئی

ریاض :- حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی — میکشو یہ بھی کوئی نام ہیں میخانوں کے

غالب :- ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق، — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

ریاض :- چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

داغ :- میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ — ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

ریاض :- اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

میر :- برقعے کو اُٹھائے ہوئے وہ بُت اگر آئے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

سودا :- سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ — کیا جانئے تونے اُسے کس حال میں دیکھا

داغ :- بُت کو بُت اور خدا کو جو خُدا کہتے ہیں، — ہم بھی دیکھیں کہ تجھے دیکھ کے کیا کہتے ہیں

ریاض :- تھیں کیونکر بتائیں دل پر اپنے جو گزرتی ہے — تمھیں کیوں کر دکھائیں تم میں جو عالم نکلتا ہے

غالب :- بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں،

ریاض :- ریاض ایسا گیا گزرا نہیں جو شان جانے دے — گدائی کے لئے لے کے وہ جامِ جم نکلتا ہے،

ریاض :- کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض — زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

غالب :- منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہئے

ریاض :- قیامت ہے بشر کے واسطے مجبور ہو جانا — زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

آسی غازیپوری :- ہم ایسے بدنصیبوں کی لحد اور اس کو تو روندے — ترا ہر نقشِ پا رشکِ بہارِ حشت جنت ہو،

ریاض :- خدا جانے یہ کیسی رہگذر ہے کس کی تربت ہے — وہ جب گزرے ادھر سے گر پڑے کچھ پھول دامن سے

میر :- میر کے دین اور مذہب کو کیا پوچھتے ہو اب ان نے تو — قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترکِ اسلام کیا

ریاض :- گلا میٹھا ہوا، خدمت اذاں کی اور کعبے میں، — بھلے کو ہم دبا لائے تھے نا قوس برہمن کو

دوسرے شعرا اور ریاض کے مندرجہ بالا اشعار ملتے جُلتے موضوع پر ہیں۔ اس طرح کے اور کثیر التعداد اشعار دوسرے ملتے جلتے موضوع پر دوسرے شعرا اور ریاض کے یہاں سے یکجا کئے جا سکتے ہیں۔ اول یہ تو ریاض اور دوسرے شعرا کے اشعار میں بھی رسمی اور روایتی باتوں کی ملے گی، دوسری یہ دہلوی یا لکھنوی رنگ میں رنگی ہوئی یا دونوں رنگوں کے میل جول کے ساتھ ملے گی، تیسری یہ اس رنگ میں رنگی ہوگی جو اس زمانہ کا عام رنگ تھا جب شعر کہا گیا اور چوتھی یہ ہر شاعر کے مزاج کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ملے گی بشرطیکہ شاعر کی اپنی شخصیت یا انفرادیت ہو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ریاض نے زندگی اور زندگی کے دُکھ سُکھ اور زندگی کا رنگ روپ اسی طرح دیکھا تھا جس طرح ان کے پہلے یا بعد کے شعرا نے۔ عشق سب نے کیا تھا یا کم از کم عشق کے کچھ چرکے سب نے کھائے تھے وہی پھریریاں سب کے اندر اُٹھی تھیں۔ پھر ایک ہی چوٹ کھا کر فریاد کی لے اتنی مختلف کیوں ہے۔ نالہ پابند نے کیوں نہیں ہو سکا۔ پہلا سبب تو انسانی انفرادیت کا اختلاف ہے، جس نے ایک ہی وقت میں میر سے یہ کہلوایا کہ :- سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اور سودا سے یہ کہلوایا کہ :- سودا کے سرہانے جو ہوا شورِ قیامت — خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

لیکن جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے پورا لکھنؤ اور لکھنؤ کے تمام شعرا ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مصحفی، انشار، جرات، ناسخ، آتش، امیر، ریاض میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ فرق وہ نہیں ہے جو میر اور سودا میں تھا۔ یہاں ہر شاعر کی خصوصیت کے باوجود مزاجِ شاعری یکرنگی اور یکسانیت زیادہ ہے۔ یہاں کا پنچائتی رنگ ایک ہی ہے۔ یہاں کی شاعری رسمی اور روایتی پہلے ہے، انفرادی یا حقیقی بعد کو۔ لفظ بیتی پہلے ہے، آپ بیتی اور جگ بیتی بعد کو۔

اسی رسمی و روایتی زندگی کی فضا میں ریاض اور ریاض کی شاعری نے سانس لی۔ جہاں عشق کرنا اور غمگین نہ ہونا ایک نیا تجربہ تھا۔ عشق کے جذبات یہاں نئے تھے اور عشق سے متاثر زندگی کچھ سے کچھ ہوگئی تھی۔ سطحیت یا اوچھے پن کا عیب حسن و عشق کی اس زندگی میں ضرور ملتا ہے لیکن اپنے حدود میں اور اپنی جگہ یہ تمام معائب یہ تمام تصنع، یہ سوانگ اور بہروپ فطری چیزیں تھیں اور جس طرح میر اور ان کے ہمنواؤں کی زندگی و شاعری انسانی مزاج کے ایک پہلو کی نمایندگی کرتی ہیں اسی طرح اہلِ لکھنؤ کی زندگی و شاعری انسانی مزاج کے دوسرے پہلو کی نمایندگی کرتی ہے۔ لکھنؤ کے جھوٹ میں ایک سچائی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس دروغ ناصداقت سے ہماری آجکی زندگی مانوس وہم آہنگ نہیں ہے۔ غم کا بھی ایک طربیہ پہلو ہوتا ہے اور نشاط کا بھی ایک المیہ پہلو ہوتا ہے۔ اہلِ لکھنؤ بھی گوشت و پوست کے بنے ہوئے انسان تھے۔ محبت میں ناکامیاں انھیں بھی ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے ناخوشگوار یا تلخ اثرات کا ردِ عمل میر و سوز کے زمانہ سے مختلف ہوتا تھا، یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ المیہ و طربیہ ایک ہی زندگی کے دو پہلو ہیں، تو میر اور ریاض میں جو فرق ہے وہ مسرت و الم کے احساس کا فرق ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بغیر عورت کے طربیہ کا تصور ناممکن ہے۔

لکھنوی زندگی اور شاعری میں مردوں اور عورتوں کی جو رنگ رلیاں ہیں اور جنھیں ہم مصحفی، انشار، جرات، ناسخ و آتش، امیر و ریاض سے لیکر آج تک کی لکھنوی زندگی و شاعری میں پاتے ہیں اور جس سے انیس و دبیر کے مرثئے بھی خالی نہیں ان رنگ رلیوں کی جگہ دہلی میں عشق کو صرف تنہائی ملتی ہے اور زیادہ تر امردپرستانہ محبت کے تجربے اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں۔

ریاض غیر معمولی ذہانت کے آدمی تھے۔ ان پر جوانی اور زندگی پھٹی پڑتی تھی۔ لکھنؤ کے دورِ انحطاط میں لکھنؤ کی سو برس کی بزم آرائیاں سمٹ کر ان کی شخصیت میں سما گئی تھیں اور وہ تمام بانکے عاشق اور ماہ پارہ عورتیں جنھوں نے کبھی لکھنؤ کو لکھنؤ بنا دیا تھا سب کے سب ریاض کی زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ سو برس کے لکھنؤ نے اپنے آخری لمحوں میں ریاض کے اوپر اپنے آپ کو صدقے کر دیا، لٹا دیا۔ پورا لکھنؤ مٹ کر ریاض بن گیا۔ ہر دورِ انحطاط میں یہی ہوتا ہے — بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

مٹتے مٹتے وہ بے جان جھوٹ جس کا نام لکھنؤ تھا ایک جیتا جاگتا چلتا پھرتا ہنستا بولتا سچ بن گیا ریاض کے روپ اور بھیس میں۔ جس تاثر، خلوص اور انفعال کا فقدان لکھنوی زندگی و شاعری میں ملتا ہے اُس نفی کی نفی (Negation of Negation) ریاض تھے۔

اب سے کوئی بیس برس پہلے میں نے رسالہ زمانہ کانپور میں ریاض پر ایک مفصل مضمون شایع کرایا تھا۔ یہ ریاض کا پہلا باقاعدہ مطالعہ تھا۔ اپنے اس مضمون میں میں نے یہ الفاظ لکھے تھے:۔

"اور شاعروں پر کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ لیکن ریاض کی شخصیت کل کیفیات پر حاوی ہے۔ وہ جذباتِ فطرت کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اسکی روحِ شاعری کی وسیع دنیا میں اٹکھیلیاں کرتی ہے۔ وہ حسن و عشق کے معرکے میں نہایت آزادی سے دل کو سینہ سپر کرتا ہے اور جہاں چوٹ کھا جاتا ہے وہاں ایسی چٹیلی مسکراہٹ سے اس کا جواب دیتا ہے کہ جیت اسی کے ہاتھ رہتی ہے ...... ریاض اپنے تخیل کے کبھی شکار نہیں ہوتے۔ وہ اپنی ہستی کو اپنے تخیل میں نیست و نابود نہیں ہونے دیتے۔ جس طرح ایک پھول سے بُو پھوٹتی ہے اسی طرح ریاض کے دل سے نکے ترانے نکلتے ہیں"

دوسرے شعرا کے اشعار کے ساتھ ریاض کے جو اشعار میں آپ کو سنا چکا ہوں ان میں ریاض کی بے لاگ شخصیت کی جھلک آپ نے دیکھی ہوگی۔ یہ اشعار اس دلگرفتگی و سپردگی سے معرا ہیں جس کی مثالیں میر اور ان کے ہمنواؤں کے یہاں ملتی ہیں اور بجائے اس کے کہ حسن و عشق کی کیفیتیں ریاض پر طاری ہوں خود ریاض ان کیفیتوں پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ریاض کے کچھ اور اشعار دیکھئے:۔

اے بتو تم سے اگر آنکھ چرائی ہو کبھی — حشر میں بھی مجھے اللہ کا دیدار نہ ہو

نزع میں یار سے پیمانِ وفا کرتے ہیں — اس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

کون دل ہے مرے اللہ جو ناشاد نہیں، — کون دل ہے مرے اللہ جو برباد نہیں
اے نسیم سحری ساتھ لئے جا سوئے بام — نفسِ سرد ہے نالہ نہیں فریاد نہیں

نگاہ سے بھی ہیں گستاخ دستِ شوق مرے — نہ کوسئے گا ذرا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے مجھے

اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے — تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے
نہ ہو یہ کہنے کو ہم سے کہے گئے واعظ — حرم کو جاتے ہوئے مُنھ بتوں کا چھو آئے
دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا، — کلیم طور پر اُن سے جو گفتگو آئے

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں

دن کو روزہ عید شب کو ہے عجب شغلِ ریاض — رات بھر پیتا ہے یہ مردِ مسلماں آج کل

ہم آ گئے ہم پا گئے ہم لے گئے اُن کو، — وہ کھوئے گئے کوچۂ دشمن سے نکل کر

یہ شخص شاعر ہے یا کرشن کنھیا؟

ہم سوئے کوہ گئے قیس کو دینے آواز — یار آجاؤ ذرا ماتم فرہاد کریں،

قیامت اور قیامت میں آئی قہر ہوا — بتوں نے چھیڑ دیا سامنے خدا کے مجھے

یا یہ پوری غزل لے لیجئے:۔

کوچۂ یار میں یہ جائیں گے ہم سے پہلے — اُٹھتے ہیں نقشِ قدم آج قدم سے پہلے
کام لیتے وہ کرم سے تو ستم ہو جاتا — خیر گزری کہ پڑا کام ستم سے پہلے
بزم آرائیوں کے کس نے سلیقے سکھلائے — ہم سے گزرے ہیں بہت خسرو و جم سے پہلے
میکدہ سے جو گیا میں تو سوئے دیر گیا — ابکی جاؤں تو ملوں اہلِ حرم سے پہلے
میری توبہ نے خرابات بنایا اس کو — میکدہ باغ جناں تھا مرے دم سے پہلے
صدقے شوخی کے یہ ڈرتا ہوں دمِ وعدۂ وصل — لب پہ آجائے تبسم نہ قسم سے پہلے
آج سر پر لئے میخانہ ریاض آتے ہیں — کوئی کہہ آئے ذرا اہلِ حرم سے پہلے

یا چند اور اشعار لیجئے:۔

ملا ہو خون جس میں کچھ وہی تو کام آتا ہے — کلیجہ مُنھ کو آتا ہے جو دل کا نام آتا ہے
یہ کہہ کر فلک تک لے گئی آہِ رسا مجھ کو — اب ان کا بام آتا ہے اب اُن کا نام آتا ہے

ہمارے دل میں ہے جو داغ ایسا کم نکلتا ہے — یہ بن بن کر چراغ محفلِ ماتم نکلتا ہے

اسی غزل کا مندرجہ ذیل شعر غیر متوقع حد تک جدید تغزل کی گہرائی اور جدلیت کی پیش گوئی ہے:-

سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لیکے بیٹھے ہیں — رفو کرنے کو تارِ دامنِ مریم نکلتا ہے

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی — میکشو یہ بھی کوئی نام ہیں میخانوں کے

یہ تھی لکھنوی زندگی و شاعری اور یہ تھا اس کا ردِ عمل جو ریاض کے یہاں نظر آتا ہے۔ ریاض کے لئے حسن و عشق محض الفاظ نہیں تھے، محض رسم و روایت۔ انھوں نے عشق کیا تھا۔ وہ آپ اپنے کو اور اپنے عشق کو پہچان سکتے تھے۔ جس کو ہنسنا ہی آتا ہے رونا نہیں آتا وہ بھی غم نا آشنا نہیں ہوتا۔ شوخ و شریر چھیڑوں میں کبھی کبھی وہ ٹیس اور کسک ہوتی ہے جو ذرا کمیاب ہے۔ خوشی بھی غم ہی کا ایک عنوان ہے اور غم بھی خوشی کا سمٹ کر غنچہ سربستہ ہو جاتا ہے۔

ہاں تو ہم لکھنوی زندگی و شاعری کو جو کچھ بھی کہیں لیکن وہ زندگی و شاعری اپنے تمام جھوٹ سمیت جب ریاض بن جاتی ہے تو ہم اسے ایک سچی زندگی و شاعری کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اب وہ اتنی بے رہ نہیں رہ جاتی، اب وہ محض الفاظ کا ایسا کھیل نہیں رہ جاتی، اب وہ کوہ کندن و کاہ برآوردن کی طفلانہ کوشش نہیں رہ جاتی، اب وہ زندگی سے اتنی الگ تھلگ نہیں رہ جاتی کہ ہم اسے محض جھوٹ کہہ کر ٹال دیں۔ بات یہ ہے کہ لکھنوی زندگی میں حسن و عشق کا جو معیار تھا وہ دہلوی حسن و عشق کے معیار کا دوسرا رخ تھا۔ اس دوسرے رخ کی کچھ حقیقی جھلک مصحفی، انشاء، اور جرأت کے یہاں نظر آئی تھی، پھر ناسخ اور ان کے مقلدین نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا اور عام طور پر اہل لکھنؤ نے بھی اسے جھوٹا بنا دینا اپنی کمزوریوں کے لئے نسبتاً آسان پایا۔ خلوص کے ساتھ چھیل چھبیلا بننا بھی ذرا مشکل کام ہے۔ یوں تو طربیہ اور نشاطیہ رنگ شاعری دہلی میں شاہ حاتم سے شروع ہو جاتا ہے بلکہ ولی دکنی اور دکن کے دوسرے شعراء سے، اور سودا کے یہاں یہ رنگ اپنے پورے نکھار پر پہونچ جاتا ہے، پھر بھی سودا، ذوق، مصحفی اور جرأت سب کے سب کم و بیش عشق زدہ بھی ہیں اور مغلوب الحسن بھی۔ (انشاء نسبتاً بہت آزاد ہیں)۔ بہرحال میر اور سودا عشق کے دو رُخ پیش کرتے ہیں۔ سوال المیہ اور طربیہ کا اتنا نہیں ہے جتنا عشق کے زیر اثر بچ رہنے یا مٹ رہنے کا ہے خواہ عاشق عشق و حسن سے مغلوب ہو یا حسن و عشق عاشق سے؟ ہم جذبات کے شکار بن جائیں یا جذبات پر حاوی ہو جائیں یا بقول انگریزی شاعر ورڈس ورتھ ایک دوسرے پر باہمی فرماں روائی ہو (Mutual domination) ہو

دیکھئے ایک ہی جذبہ ہے مگر میر پر اس کا کیا اثر ہوا ہے اور اسی جذبہ پر آتش کس طرح حاوی ہے۔

میر :- ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر — کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

آتش :- دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا — خاک پر سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا

یا غالب اور آتش ایک ہی محرومی کو کس طرح لیتے ہیں:-

غالب :- منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہئے

آتش :- موت مانگوں تو ملے آرزوئے خواب مجھے — ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

تو کیا میر و غالب کی بات سچ ہے اور آتش کی بات جھوٹ ہے؟

ان مثالوں سے کچھ کھل گیا ہوگا کہ مغلوب الجذبات ہونا یا جذبات پر غالب آنے میں کیا فرق ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ ایک ہی جذبہ میں فعلیت و مجہولیت، آزادی و مجبوری میں کیا فرق ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ میر کے جذبۂ عشق میں سوز و گداز جس عنوان سے موجود ہے

اس میں محض عشق کی ناکامی کو دخل نہیں ہے بلکہ میر کی مالی حالت کو بھی دخل ہے۔ مالی خوشحالی کے ساتھ کوئی میر بن ہی نہیں سکتا۔ بقول برنارڈ شا ایک ٹوٹا ہوا دل اور ایک بھری ہوئی جیب کا ساتھ بہت خوشگوار ہوتا ہے (A broken heart & a full pocket go very well together)۔ میر اور ان کے ہم مزاج فاقی ایسے لوگ معشوق کو پاکر بھی ایک ماورائی اتحاد و اتصال یا خلوص و سپردگی کے شیدا تھے۔ وہ معشوق کو رگِ جاں سے زیادہ قریب دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ مستقبل کی تہذیب میں عشق و حُسن میرتی ہوں گے یا سودائی۔ یا دونوں کے امتزاج سے کسی نئی دنیائے حُسن و عشق کی تخلیق و تعمیر ہوگی۔ کم سے کم ٹھیٹھ میرتی نظریہ خالی از علت نہیں۔ میں اس باب میں برنارڈ شا کا قول نقل کرتا ہوں :۔

"Do not let us fall into the common mistake of expecting to become one flesh and one spirit. Every star has its own orbit; and between it and its nearest neighbour there is not only a powerful attraction but an infinite distance. When the attraction becomes stronger than the distance the two do not embrace: they crash together in ruin. We two also have our orbits, and must keep an infinite distance between us to avoid a disastrous collision. Keeping our distance is the whole secret of good manners; and without good manners human society is intolerabe + impossible." (The Apple Cart)

یہ امر قابل غور ہے کہ ہم جو لکھنوی عشق و شاعری کو محض علم مجلس بتاتے ہیں اس میں کچھ صداقت بھی ہے یا نہیں، اصلیت کا کوئی پہلو بھی اس میں پنہاں ہے یا نہیں۔ خوشحالی نے کیا لکھنوی زندگی عشق و شاعری کو زیادہ متوازن نہیں بنا دیا تھا۔ کیا وہ سب محض جھوٹ تھا یا ایک جھوٹ نما سچ ؟ لکھنؤ سے اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو یہ نہیں کہ لکھنؤ، دلی کیوں نہیں بن گیا بلکہ یہ کہ لکھنؤ قرینہ سے لکھنؤ بھی نہ بن سکا اور بنا تو اس وقت جب وہ مٹ چکا تھا۔ ریاض کی زندگی و شاعری میں لکھنؤ اپنی بھرپور جوانی پر ہے، اپنے پورے نکھار پر۔

ریاض کی زندگی ہی میں زمانے کی ہوا بدل چلی تھی۔ ادھر امیر و داغ کا طوطی بول رہا تھا اور حالی کا مد و جزر، اقبال کا شکوہ و جواب شکوہ ابھی ان جیبوں میں کھوئے ہوئے تھے لیکن اسی زمانہ میں جلال غزل کی آواز میں کچھ ایسا درد بھر رہے تھے جو بعد کو چمک جانے والا تھا :۔

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا
گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلف یار کی بو پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اور تعشق اسی لکھنؤ میں یوں نغمہ سرا ہو رہے تھے :۔

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو اُداس بیٹھے ہو — یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھے ہو
وہ اپنے در کے فقیروں سے پوچھتے بھی نہیں، — کہ تم لگائے ہوئے کس کی آس بیٹھے ہو

عظیم آباد میں شاؔد، غازیپور میں آسؔی، پانی پت میں حاؔلی اسی زمانہ میں غزل کے قہقہوں اور چہچہوں میں ایک نیا چٹیلا پن بھر رہے تھے ریاؔض غالباً شاؔد سے دو ایک سال آگے پیچھے مرے لیکن اور سب ان کے سامنے ہی مر گئے تھے۔ اور اُن کے سامنے ہی یگاؔنہ، عزؔیز، حسرؔت موہانی، فاؔنی اور اصغرؔ کے نئے نغمے فضا میں گونجنے لگے تھے۔ اسے کوئی چاہے تو یوں بھی کہہ لے کہ ریاؔض کے سامنے ہی ریاؔض کی شاعری کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن لکھنؤ کی اس یادگار پر سب کی نگاہیں پڑ جایا کرتی تھیں۔ اُنھیں پرانی چیز، ماضی کی چیز، کہنے کو کسی کا جی نہیں چاہتا تھا زندگی کل کی ہو یا آج کی پھر بھی زندگی ہے اور یوں تو کتنے زندہ مشہور شعرا ابھی کچھ کل کی چیز ہو گئے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ریاؔض کے کلام کا نکھار اور اُس کی تازگی کبھی باسی ہو سکے گی یا نہیں۔ وقت سے سچا اور وقت سے جھوٹا کوئی نہیں ہوتا۔ جس طرح یورپ کی اٹھارویں صدی کو اہلِ یورپ نے پہلے محض تصنع و تکلف کہکر ٹال دینا چاہا تھا اور بعد کو اس میں زندگی کے عناصر کا اعتراف کیا اسی اٹھارویں صدی کی زندہ دلی اس کی ظاہری شان اس کی نظر فریب سطحیت ہندوستاؔن میں اُنیسویں صدی تک جلوہ گر رہی اور اُردو شاعری میں یہ جلوہ گری ریاؔض کی شوخ شخصیت ہے۔ کل کی دُنیا نہ میرؔ کی دُنیا ہوگی نہ ریاؔض کی اور اگر وہ اقباؔل کی دنیا بھی ہوئی تو ایسی کہ اسے اقباؔل خود نہ پہچان سکیں گے۔ لیکن کیا عجب کل کی دُنیا کسی کی دنیا نہ ہوتے ہوئے یا سب کی دنیا ہوتے ہوئے بھی ریاؔض کی جھلکیاں دکھاتی رہے۔ کیا کل کی تہذیب میں کُھل کھیلنے کے موقعے نہ ملیں گے۔ ہم مایوس کیوں ہوں —— اُردو کی طربیہ شاعری شاہ حاتؔم اور سوداؔ سے شروع ہو کر نظیؔر، مصحفیؔ، انشاؔ، جرأتؔ، آتشؔ، امیرؔ، داغؔ اور ریاؔض پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے قہقہوں میں جو انفرادیت ہے ریاؔض اور ان کے ان ہم جلیسوں کی طبیعتوں میں جو رنگین فرق ہے، یہ اپنی جگہ ایک بہت دلچسپ موضوع ہے۔ پھر بھی یہ کہنے کی بات ہے کہ اس بزم میں جو گھا گھپن ریاؔض میں ملتا ہے، یہاں تک کہ کُڑھنے کا اور دلگیر ہو جانے کا جو انداز ریاؔض کا ہے وہ ریاؔض ہی کا حصہ ہے۔ ریاؔض کی خمریات کا ذکر اکثر لوگوں نے کیا ہے اور اس طرح گویا وہ اسی رنگ کے شاعر تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو بات ان کے خمریات میں ہے وہی بات ریاؔض کے تمام اشعار میں ہے:۔

موت — احباب کے کاندھے سے لحد میں اُتر آئے — کس چین سے سوتے ہوئے ہم اپنے گھر آئے
خمریات:۔ اتنی تو پتہ کی ہے کہ بہکے ہوئے ہم تھے — مجرم ہیں جو واعظ کی کہیں سے خبر آئے
جلوۂ حشر:۔ شوخی سے چمک کر ادھر آئے اُدھر آئے — کس چین سے سوتے ہوئے ہم اپنے گھر آئے
بہار و بلبل:۔ بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی — کہ ڈھونڈھتے ہیں تو اب آشیاں نہیں ملتا
حُسن و عشق:۔ گُل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے — شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے
صلاحیت عشق یا فنِ عاشقی:۔ نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا — مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا
سر پٹینا:۔ ہے پری خانہ وہ گھر شیشۂ در ٹوٹ نہ جائے — سر پہاڑوں سے میں ٹکراؤں کہ سر ٹوٹ نہ جائے
حُسن کا شوق خود آرائی:۔ زیور کے انتخاب نے شب ہی گزار دی — مہندی چھٹی جو ہاتھ سے زیور کے ہو گئے
قیس و فرہاد:۔ جا تا نہ ہو فرہاد کہیں قیس سے ملنے — وہ کون چلا کوچۂ دشمن سے نکل کر

جو بات ان اشعار میں ہے (یعنی خلوص کا تکلف بن جانا اور تکلف کا خلوص بن جانا) وہی بات ریاؔض کے خمریات میں بھی ہے۔ یہ جذبات نگاری نہیں ہے اداکاری ہے مگر کتنی مکمل، کتنی جاذبِ نظر۔ ناسخ کا جھوٹ ریاؔض کا سچ بن گیا ہے یعنی لکھنؤ والے جب بگڑ کر بنے تو اس عمل کا نام ریاؔض ہو گیا۔

ریاض کے بعض انتقادی مباحث

(۱)

جناب سید محمد عسکری صاحب وسیم مرحوم و مغفور کے زمانۂ قیام گورکھپور میں گلدستۂ "تحفۂ خوشتر" میں حضرت ریاض کی ایک غزل پر کسی صاحب نے اعتراض کیا تھا اس کے جواب میں حضرت مرحوم نے وسیم صاحب مرحوم کو ایک خط تحریر کیا تھا ہم وہ خط اور اس پر وسیم صاحب کا نوٹ جو ہمارے پاس محفوظ ہے بجنسہ پیش کرتے ہیں۔

جناب بھائی صاحب - تسلیم

مشرق میں آپ کی اصلاحیں دیکھیں یہ آپ کی قادر الکلامی کو ظاہر کر رہی ہیں بعض اصلاحیں تو ایسی ہیں جنھیں الہام کہنا چاہئے میں کیا روح امیر ناز کرتی ہوگی میری غزل پر ایک صاحب نے اعتراض کئے ہیں۔ میں اپنی رائے آپ کو لکھتا ہوں آپ اپنی رائے سے مجھ کو آگاہ فرمایئے۔

شعر ریاض :- تنکے چنکر ہم جفائے باغباں دیکھا کئے　　روز بنتے روز اُجڑتے آشیاں دیکھا کئے

اعتراض - تنکے چنکر خلاف محاورہ ہے - تنکے چنا مراد ہے دیوانہ وار حالت سے۔

قول ریاض -- یہاں تنکے چنا اصلی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے یعنی تنکے جمع کر کے - کسی فرش پر چند تنکے پڑے ہوں اور کسی سے کہا جائے یہ تنکے چن لیجئے تو کیا اس کا مفہوم دیوانہ وار حالت ہوگی - میں تو سمجھتا ہوں تنکے چن لیجئے سے تنکے صاف کر دیجئے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ موقع کے اعتبار سے لفظ چُنا کے معنی بدلتے رہیں گے - کسی کا شعر ہے :-

بڑی ہی مصیبت سے تنکے چنے تھے　　نہ ٹھہرے مگر آشیانے کے قابل

وسیم صاحب - تنکے چُنا یعنی تنکے فراہم کرنا اصلی معنی میں صحیح ہے۔ آتش مغفور فرماتے ہیں :-

چُنے مہینوں ہی تنکے غریب بُلبل نے　　مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہوا

شعر ریاض :- ایسے غافل وہ یہ سمجھے دیکھتے ہیں خواب ہم　　آتے جاتے شب میں مجھکو پاسباں دیکھا کئے

اعتراض - عاشق کی کیا طاقت کہ آتا جاتا اور معشوق غل نہ مچاتا ہاں یوں ہوتا تو شاید کچھ ہوتا :-

میں لباسِ غیر میں تھا مجھکو کیا پہچانتے　　آتے جاتے شب میں مجھکو پاسباں دیکھا کئے

قول ریاض - میرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مجھے پاسبانوں نے شب میں آتے جاتے دیکھا مگر وہ ایسے غافل اور مطمئن تھے کہ میرا آنا جانا محال سمجھ کر سمجھے تو یہ سمجھے گویا خواب دیکھ رہے ہیں۔

وسیم صاحب - شعر کی یہ شرح صحیح ہے اعتراض رفع ہو گیا لیکن معترض صاحب کا مصرع بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ معترض صاحب شاعری سے کچھ واسطہ رکھتے ہیں۔

شعرِ ریاضؔ :۔ زرفشاں شب کو قبائے آسماں دیکھا کئے　　عمر بھر ہم پیرِ گردوں کو جواں دیکھا کئے

اعتراض ۔ زرفشاں کی جگہ رنگین ہونا چاہئے۔

قولِ ریاضؔ ۔ شب کی رعایت سے رنگین کو زرفشاں پر ترجیح نہیں ہوسکتی ۔

جوابِ وسیم ۔ بہت صحیح ۔

شعرِ ریاضؔ :۔ مٹی دے کر مری مٹی میں ہوئے اچھے شریک　　خاک میں ملتا رہا ہیں، مہرباں دیکھا کئے

اعتراض ۔ مٹی دیکر، خاک میں ملاکر کی جگہ غلط ہے۔

قول ریاضؔ ۔ تدفین کی رسم مٹی دینے سے تعبیر کیجاتی ہے۔ زبانوں پر ہے کہ ہم فلاں شخص کو مٹی دینے گئے تھے اور اس کو مٹی میں شریک ہونا بھی بولتے ہیں۔ دماغ بہت ضعیف ہوگیا ہے اس لئے میں خود کوئی رائے نہیں قایم کرسکتا۔ معترضین کا احسان ہے کہ اصلاح کی کوشش فرماتے ہیں۔

جوابِ وسیم ۔ مثنوی زہرِ عشق کا مصرع ہے :۔ مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

(۲)

مجدد الوقت جناب شوکت میرٹھی نے بھی اپنے رسالہ "پروانہ" میں ایک بار تحریر فرمایا کہ :۔ ازلؔ نے حضرت امیرؔ مینائی مرحوم کی چوری پکڑی تھی اور مال بھی ایک کنگال یعنی غنیؔ کشمیری کا مگر اب ایک دوسرا چور گرفتار ہوا ہے کون مرزا اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی۔ مال کس کا مشہور شاعر ناصر علی کا۔ غالبؔ فرماتے ہیں :۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ رخسار کے آگے　　پرافشاں جوہر آئینہ مثلِ ذرہ روزن میں

ناصر علی مرحوم کا مال یہ ہے :۔

تو تا آئینہ را رو داری اے خورشید خاور ہا　　برنگ ذرۂ روزن بہ پرواز ند جوہر ہا

داغؔ کے دونوں شعر ماشاءاللہ بہت خوب ہیں اُستادجی ڈنٹر پلنے کے قابل ہیں ۔ سید ضامن علی جلالؔ کے دو شعر اصلاح کے محتاج ہیں ۔ حضرت ریاضؔ خیرآبادی ماشاءاللہ چلبلی طبیعت رکھتے ہیں اور اُستادوں میں سے ہیں ان کا شعر:

کوئی منھ چوم لے گا اس ہنسی پر　　شکن رہ جائے گی یونھیں جبیں پر

خاصہ ہے مگر مصرع اولیٰ میں (اس) حشو ہے اگر ہم مضمون کو بلند کردیں جب تو ہماری تجدید تسلیم ہوگی لیجئے :۔

کوئی منھ چوم لے گا اس ہنسی پر　　دھری رہ جائے چین طاق جبیں پر

ایک اور شعر :۔ لہو بیکس کا مقتل کی زمیں پر　　نہ دامن پر نہ ان کی آستیں پر

بہت خوب حسرت بھرا مضمون ہے ۔

اس کے جواب میں حضرت ریاضؔ کی تحریر ملاحظہ ہو جو طنزیات نگاری کی بہترین مثال ہے :۔ "کوئی شکریہ ادا کرے یا نہ کرے ہم دل سے ان الفاظ کے لئے شکر گزار ہیں جو ہمارے مرتبہ سے کہیں زیادہ ہمارے لئے فیاضانہ صرف کئے گئے ہیں ۔ اپنے عیب کے قبول کرنے میں تامل کیا البتہ اصلاحِ عالی سے افتخار حاصل کرنے میں اس لئے پس وپیش ہے کہ مجدد الوقت کی فکرِ آسماں پیوند نے اس کو اس قدر بلند کردیا ہے کہ وہ ممدوح کے سوا کسی اور کے مرتبہ پر زیب نہیں دیتا۔ ہم عطائے تو بہ لقائے تو کہنے کے خواستگار ہوتے مگر ادب یہ بھی کہنے کی اجازت

نہیں دیتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:۔

صدقے اپنی درازیِ قد کے	وہ مجھے بیوقوف کہتے ہیں،

ہم بھی اپنے عیبِ کلام پر ہزار بار صدقے کہ ایسا باکار ریفارمر اور ایک ادبی شخص کے عیبِ کلام کی طرف فیاضانہ توجہ۔ ہم امید کرتے ہیں مجدد الوقت جناب شوکت کو آیندہ بھی توجہ رہے گی گو قبولِ اصلاح میں مجھکو بے جا تعب اور تکلف ہو مگر یہ کیا کم ہے اپنے عیوب سے مجھکو آگاہی ہوتی رہے گی۔	ریاض الاخبار ۲۸ جولائی ۱۸۹۶ء

(۳)

حادثہ کی جمع حوادث اور حادثات اور جمع حوادثات کی بحث کے سلسلے میں بعض اخبارات میں ایک مرتبہ اچھا خاصہ مباحثہ چھڑ گیا تھا اس کا فیصلہ حضرت ریاض کی زبان سے سنئے:۔

حوادثات کی صحت پر ہمارے بعض دوستوں کو بہت اصرار ہے اور ساری قوت صرف کیجاتی ہے کہ اسکو مان لیا جائے مثالیں بھی پیش کیجاتی ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان دوستوں کو خاص لفظ حوادثات کی سند کسی عربی شعر سے نہیں ملتی۔ ہم عالم فاضل مولوی کامل پرچہ اخبار کے اڈیٹر صاحب سے خصوصیت کے ساتھ تمنا رکھتے ہیں جنھوں نے بڑی شد و مد سے نوٹ دیا ہے۔

اڈیٹر صاحب مفیدِ عام سے ہم کو صرف اسی قدر کہنا ہے کہ انھوں نے ہماری نسبت ایک شک کیا ہے وہ غلط ہے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپس میں تو تو میں میں ہو، نہ ہم ان کو شتر سے لڑوانے کا ارادہ رکھتے ہیں، مولوی سید افتخار عالم صاحب کے اور ہمارے تعلقات ایسے کمینے خیالات پر مبنی نہیں ہیں جن کا یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے ہم کو اس تحریر سے سخت افسوس ہوا۔

حوادثات کے متعلق جو کچھ ہمارے دوست نے لکھا ہے وہ جمع الجمع کے قاعدے کے خلاف ہے، اب رہا سماعی معاملہ وہ بغیر کسی خاص سند کے قابل تسلیم نہیں اور سند بھی شعر سے ہونا چاہئے اور شعر بھی عربی کا مسلم الثبوت اُستاد حالی کی جو سند پیش کیجاتی ہے اس کی نسبت صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ وہ مقبول فریقین نہیں ہیں اور یہ اُصولِ مناظرہ کے خلاف ہے کہ سند میں کوئی غیر مقبول شخص پیش کیا جائے۔ سرسید وغیرہ کی زبان کے متعلق بحث بیکار ہے وہ نہ مستند مانے جاتے ہیں نہ کوئی ان کو فصیح البیان سمجھتا ہے۔ وہ جس کام کے آدمی تھے خدا ان کی مغفرت کرے وہ ان کے ساتھ گیا اور اگر غلط الفاظ منشی امیر احمد مرحوم ہی استعمال کرتے تو کون تسلیم کرتا۔ اُردو کی وسعت کا یہ طریقہ نہیں ہے توسیع زبان کا مسئلہ نازک ہے۔ حوادثات کے لئے حوادث اور حوادثات تو موجود ہی ہیں پھر اس قدر توسیع کی کیا ضرورت ہے۔ ریاض الاخبار ۲۴ اگست ۱۸۹۶ء

(۴)

جناب احسن لکھنوی کے واقعات انیس کا تذکرہ کرتے ہوئے میر ناصر علی صاحب نے "صلائے عام" میں لکھا تھا کہ میر کے خصائل اور اس کا طرز معاشرت یعنی یہ کہ وہ کس وقت سوتا ہے کس وقت جاگتا ہے کیا کھاتا ہے کیا پیتا ہے وغیرہ کی تفصیل کے بجائے اگر کلام پر وسیع نظر سے تنقید ہوتی اور دبیر سے موازنہ کیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا۔ صلائے عام کی اس تحریر کو تائیداً ریاض الاخبار نے اپنے کالموں میں نقل کیا جناب احسن نے دبی زبان سے اس کی شکایت میں یہ شعر لکھا:۔

بر من از جورِ تو ہر چند کہ بیداد رود	چوں رخ خوبِ تو بینم ہمہ از یاد رود

ہم پہلے احسن صاحب کے جواب میں میر ناصر علی صاحب کا خط درج ذیل کرتے ہیں:۔

مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر	سورج کے ہاتھ چونری ہے پنکھا صبا کے ہاتھ

واقعاتِ انیس پر مجھے رشک ہے کہ از روئے لٹریچر اس کی کیسی دھوم ہوگئی۔ ۱۲ فروری ۱۹۰۹ء کے ریاض الاخبار میں حضرت ریاض اور جناب احسن کی تحریر بہت پاکیزہ تھی۔ جب ریاض و احسن جیسے سخن رس، سخنور باتیں کریں تو پھر مجھ سے خموشی کی امید رندانِ مے آشام کی توبہ کے برابر سمجھئے

گردن میں ہے کمندِ محبت پڑی ہوئی　　جتنے کھنچے حضور میں آگے سرک گیا

جناب احسن کی طرف سے میرے مضمون کا جواب مجھے ریاض الاخبار میں مل گیا ان کی تحریر فقط جواب ہی نہیں بلکہ میرے دعوے اور امید سے زیادہ ہے۔ میں خوش ہوں کہ کس خوبصورتی سے مجھے چپ کیا ہے لیکن جیسا کہ کئی بار عرض کیا گیا "واقعات" کی نسبت محض انشا پردازی و سخن آرائی کے خیال سے لکھا گیا تھا جناب احسن سے مجھے کبھی نیاز حاصل نہ تھا واقعات کے ذریعہ سے یہ پہلی ملاقات ہے۔ جس طرح معمولی صاحب سلامت از روئے رسم مزاج پرسی کیجاتی ہے لیکن اس سے یہ غرض نہیں ہوتی کہ پوچھنے والے کو حلفاً از روئے قسم بالکل کوئی شکایات نہیں۔ اسی طرح سخن گسترانہ بحث میں بھی کسی بات کا برا بھلا نہیں مانتے۔ اور دستور ہے کہ جہاں دو آدمی ہوتے ہیں تو منھ میں گھنگھنیاں بھر کے نہیں بیٹھتے۔ میری بڑی غرض اس بحث سے یہ تھی کہ میر انیس اور مرزا دبیر کی شاعری از روئے مرثیہ گوئی دیکھی جائے اور ان دونوں کی (ادبی) خوبیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ "موازنۂ انیس و دبیر" سے یہ ضرورت پوری ہو جاتی تو میں آپکو تکلیف نہ دیتا

اے خوش آں کز ستمِ عشق تو چوں خوں گریم　　سببِ گریہ زمن پرسی و افزوں گریم

میر ناصر علی اڈیٹر "صلائے عام" دہلی۔ ۹ء

حضرت ریاض نے یوں اظہار خیال کیا:-

آج یوں زلفِ پریشاں کی بلائیں میں لوں　　زلف والے یہ کہیں آپ بناتے ہیں ہمیں،

واقعاتِ انیس کے مؤلف کا عنایت نامہ ہم درج کرتے ہیں ۔ ہمارے نوٹ کو وہ قولِ فیصل سے تعبیر فرماتے ہیں اور اس شعر کو:-

فریادِ جنوں اور ہے بلبل کی فغاں اور　　صحرا کی زباں اور ہے گلشن کی زباں اور

کچھ کہتے تو نہیں یہ کہتے ہیں۔

بہ سبب عدم واقفیتِ زبانِ گلشن شوریدہ مزاج احسن اسی صحرائی زبان میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

شکریہ ہو یا شکایت ہمیں قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔　　ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

ہم نے اپنے نوٹ میں یہ ظاہر کیا تھا کہ صاحبِ صلائے عام کو ادائے بیان میں کس قدر قابو حاصل ہے صاحبِ واقعات اسے قولِ فیصل سمجھے۔ سرِ تسلیم خم ہے۔ جو مزاج یار میں آئے، رہی صحرائی زبان، اسکے شکریے اور شکایت کے لئے صاحبِ واقعات کو شعر کا محل استعمال دیکھنا چاہیے تھا۔ توبہ توبہ وہ گلشنِ لکھنؤ کے رہنے والے صحرائی زبان سے باوجود شوریدہ مزاجی بھی انھیں تعلق نہیں ہو سکتا۔ ہم نے بہ اعتبار انشا پردازی اندازِ بیان کی نسبت یہ فرق دکھایا تھا کہ صاحبِ صلائے عام نے جو کچھ کہا نہایت نرم و دلنشیں لہجہ میں اور صاحب واقعات کا لہجہ طبیعت کی برانگیختگی ظاہر کرتا تھا۔ مضمون ذیل میں ایک حد تک صاحبِ واقعات نے اپنے لہجے میں وہی بات حاصل کر لی اب انکی آواز نغمہ سنجانِ چمن سے بہت ملتی جلتی ہے بلکہ وہی ہے۔ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا کیا کہنا دونوں مستند دونوں ٹکسالی۔

ایک کانٹے کے تلے ایک ہی سانچے کے ڈھلے
ان کے ناوک مری آہیں ترے نالے بلبل

(۵)

ایک نامہ نگار نے ریاض الاخبار مطبوعہ ۲۰ مئی ۱۸۹۶ء میں لفظ "ایجاد" کی تانیث پر بحث کرتے ہوئے مثالاً اور سنداً جناب رشکؔ کے مندرجۂ ذیل تین شعر لکھے تھے :-

وقتِ حسابِ کثرتِ اغیار وصل میں ۔۔۔ کہتے ہیں بات ٹال کے گنتی غلت ہوئی
سودا ہے حاسبانِ قیامت کا آپ کو ۔۔۔ تعدادِ جرمِ اہلِ معاصی غلت ہوئی
پروائے حرف گیریِ اہلِ سخن نہیں ۔۔۔ اے رشکؔ مستند جو کتابِ لغت ہوئی

اس پر حضرت ریاضؔ تحریر فرماتے ہیں :-

نامہ نگار صاحب کو ذاتی طور پر رائے قائم کرنے اور اس پر پابند ہونے کے لئے بالکلیہ اختیار حاصل ہے۔ اس موقع پر صرف لفظ غلت کے متعلق لائق زمانہ و مشہور روزگار جناب اقبال علی صاحب جج کے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ ہر سہ اشعار مندرجۂ بالا میں دو کا قافیہ "غلت" اور ایک کا لغت ہے، نامہ نگار نے گویا کہ رشکؔ نے غلط کو تائے قرشت کے ساتھ لکھا ہے مگر چونکہ وہ مسلم الثبوت استاد ہیں اس لئے درگزر کرنا چاہئے، مگر ہم کہتے ہیں کہ دراصل حالت یہ نہیں ہے۔ رشکؔ نے عمداً غلت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ غلت وہ غلط نہیں ہے جو صحیح کا مقابل ہوتا ہے بلکہ یہ غلت، حد سے زیادہ گزر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس "غلت" کا مستخرج "غالی" اور "غلو"[1] ہے جیسا کہ لوگوں کے زبان زد ہے کہ فلاں شخص شیعۂ غالی ہے یا فلاں شخص کو فلاں معاملے میں غلو ہے یعنی اعتدال سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ میر علی اوسط صاحب رشکؔ نے اس معنی میں یہاں "غلت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پہلے تو معشوق اپنے عاشقوں کی گنتی کو کہتا ہے کہ غلت یعنی حد سے زیادہ بڑھ گئی اسی طرح دوسرے شعر کے معنی ہیں کہ جرائم بعید ہوگئے رشکؔ نے اس میں تجنیس لفظی کے لحاظ سے بلاغت صرف کی ہے اور یہ خاص مذاق جناب رشکؔ کا ہے، یہ جدت ممدوح کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ ریاض الاخبار - ۸ جون ۱۸۹۶ء

(۶)

مثنوی گلزار نسیم کے سلسلہ میں ۱۸۹۶ء بڑا یادگار سال گزرا ہے، اس معرکہ میں ایک طرف سرشارؔ اور اڈیٹر اودھ پنچ تھے، دوسری طرف شررؔ اور اڈیٹر ریاض الاخبار۔ اس مبحث پر حضرت ریاضؔ کے خیالات ملاحظہ ہوں :-

آجکل اودھ پنچ میں یہ بحث چھڑی ہے کہ مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ نے جو اعتراض گلزارِ نسیم پر کئے ہیں صحیح ہیں یا غلط اس ضمن میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بری نوبت آگئی ہے۔ مولانا شررؔ کی نسبت بہت سخت سست الفاظ استعمال ہو رہے ہیں جن کو پڑھکر افسوس ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہمارے مکرم و محترم منشی سجاد حسین صاحب کیوں اس قدر خفا ہوگئے ہیں، شررؔ نے اگر گلزار نسیم پر ریویو کیا تو کوئی خطا نہیں کی۔ شررؔ نے اگر خوشامدانہ ریویو نہیں کیا تو واجب التعزیر نہیں۔ شررؔ کے ریویو پر اگر ہمارے مکرم و فاضل دوست کو سختی کے ساتھ کچھ لکھنا تھا تو پہلے مسٹر چکبست کی حیرت انگیز دلیری پر کچھ لکھنا چاہئے تھا جنھوں نے آتشؔ۔ رندؔ۔ صباؔ۔ خواجہ وزیرؔ۔ ناسخؔ سب کی تحقیر و توہین کی اور ایک حد تک سب کا درجہ نسیمؔ سے گھٹا دیا جبکہ یہ امر مسلّم ہے کہ نسیمؔ کی کوئی بساط اور حقیقت ان شعراء کے سامنے نہ تھی، حضرت اپنی قوم کے ایک شاعر کی مداحی کے خیال میں مسٹر چکبست نے تمام لکھنؤ کے نامور شعراء پر بہت خراب اور

---

[1] ریاضؔ کا یہ ادعا درست نہیں کہ غلت کا مادہ غلو ہے۔ غلت عربی میں منسوخ کر دینے کے معنی میں آتا ہے چنانچہ خرید و فروخت کا معاملہ جب کوئی فسخ کر دیتا ہو تو کہتے ہیں اِنغلت البیعُ والشراءُ۔ دراصل غلت اور غلط کا مفہوم ایک ہی ہے۔ نیازؔ

کمزور اور بزدلانہ حملہ کیا ہے۔

جو اعتراضات شرر نے کئے ہیں گو موجودہ زمانہ میں حرف حرف ان کا صحیح ہے مگر جس زمانہ میں نسیم تھے اسوقت کی زبان اور طرزِ کلام اور تصرفات کو دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے۔ ہمارے دوستوں کو صرف یہی لکھ دینا چاہئے تھا مگر نسیم کی غلطیوں کا جواب دینا اور غلط الفاظ کو صحیح ثابت کرنا یہ ایک بڑی جرأت ہے۔ ہمارے دوست اور عالی دماغ مکرم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمنے شرر کو دیہاتی لکھا، گو ہمارا روئے سخن شرر کی طرف نہیں تھا مگر یہاں پر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر شرر کو ہم دیہاتی لکھیں تو شرر کی کوئی توہین نہیں ہے بلکہ شرر کا فخر ہے کہ ایک دیہات کا باشندہ آج اس قابل ہے جس کی کتابیں نصابِ تعلیم میں داخل ہیں اور جس کی لکھنؤ میں سند لیجاتی ہے اور جو تمام ملک میں فخرِ لکھنؤ مشہور ہے اور اسی طرح اودھ پنچ کی وقعت و عزت تمام ملک میں ہے حالانکہ وہ بھی ایک دیہاتی اڈیٹر کے ہاتھ میں ہے۔

کہنے کو جو دل میں آئے کہو مگر جب تھوڑی دیر اس مسئلہ پر کوئی غور کرتا ہوگا تو انصاف اس کو سمجھاتا ہوگا کہ بیشک قصباتیوں کی بدولت آج زبان کا عروج ہے۔

شہری ہونے کا خیال تو میر و مرزا تک تھا اور وہ زمانہ بھی اسی کام کا تھا اب اس فضول خیال کو دل سے نکال کر یہ دیکھنا چاہئے کہ شرر نے جو اعتراض کئے صحیح ہیں یا نہیں۔

ہمارے نزدیک شرر کے اعتراض ضرور صحیح ہیں۔ آتش نے لکھا تھا ے ور ورماں سے المضاف ہوا

مگر پھر ان کی کسی نے تقلید نہیں کی اگر کوئی تقلید کرتا تو ٹوکا جاتا۔ نسیم نے اگر محل کہا تو غلط کہا۔ جان صاحب نے لکھا تو غلط لکھا۔ کوئی لکھتا یہ لفظ غلط ہی رہتا۔ اس پر اس قدر اصرار کیوں ہے کہ غلط لفظ صحیح مان لیا جائے۔

اگر ہمارے شاعروں کی شاعری کا موازنہ اسی طرح کرایا گیا تو دنیائے شاعری میں ایک شاعر بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کون کہہ سکتا ہے کہ لکھنؤ کی لونڈیاں جو غلط لفظ بولتی ہیں وہ کتابی حیثیت سے بھی صحیح سمجھے جائیں۔ لکھنؤ میں تو کبوتر کو قبوتر۔ کاغذ کو قاغذ اور علی بخش کو علی بخش کہتے ہیں۔ جناب آتش مرحوم اور جناب جان صاحب کے خطوط اور نواب نوازش علی خاں مرحوم کے گھر کی لونڈی کی دستاویز کا کوئی اثر ان اعتراضات پر نہیں ہو سکتا جو گلزار نسیم پر کئے گئے ہیں۔ ہم پھر کہیں گے کہ اس میں قابل الزام جو صاحب ہیں وہ جناب چکبست ہیں جنھوں نے محققانہ دیباچہ نہیں لکھا اور اعلان جنگ کر کے مشہور اُستادوں کی توہین کی اور غلط روایات فرضی طور پر درج کر کے لکھنؤ والوں کا دل دکھایا ایسی حالت میں اگر نسیم صاحب کی فاش غلطیاں دکھائی گئیں اور ثابت کر دیا گیا کہ یہ اس قابل نہ تھے جن کو اُستادوں کے برابر کرسی دیجائے تو کیا بری بات جناب شرر نے کی۔

رند۔ صبا۔ خواجہ وزیر۔ امانت کے کلام میں کیسے ہی عیوب چکبست صاحب نکالیں مگر عموماً ان لوگوں کی قابلیت اور ان کی زبان اپنے زمانہ میں تسلیم کر لی گئی تھی۔ وہ زمانہ تو بہت دور رہا اسوقت بھی لکھنؤ میں کشمیریوں کی زبان کی سند کوئی نہیں لیتا۔ ہمارے آنجہانی دوست جناب سرشار جنھوں نے اُردو کی دنیا میں اپنے ڈنکے بجوا دئے تھے اور جن کو لکھنؤ کی زبان کا دعوےٰ تھا ان کو بھی آخر میں یہ بات معلوم ہو گئی تھی اور اودھ پنچ نے ثابت کر دیا تھا کہ طباعی اور ذہانت اور چیز ہے اور زباں دانی اور شے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جناب نسیم کا شمار اُستادوں میں نہ جب تھا نہ اب ہے، اور ان کے کلام پر جو اعتراض کئے گئے وہ بہت صحیح تھے اس لئے کہ وہ آتش کے شاگردوں میں تھے اور آتش اور ان کے شاگرد ان ترکیبوں اور بندشوں اور اس زبان کو ترک کر چکے تھے جو نسیم نے گلزار نسیم میں لکھی ہے، "تلک" اور "مجھ پاس" اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اس وقت کسی کی زبان پر نہ تھے۔

نسیم نے ایک سخت کام اپنے سر لیا تھا وہ عیوب سے مثنوی کو نہ بچا سکے اور چونکہ محلات کی زبان اور خواص کی صحبتوں سے دور تھے اس لئے زبان کی خوبیاں بھی مثنوی میں نہ پیدا کر سکے، ہاں شاعرانہ محاسن استعارات اور تشبیہات خوب صرف کی ہیں۔

نصف صدی گزر گئی اودھ کے کسی باشندے نے گلزار نسیم پر نکتہ چینی نہیں کی، محض اس خیال سے کہ جہاں اس میں سیکڑوں عیوب ہیں، سیکڑوں خوبیاں بھی ہیں، مگر اب مسٹر چکبست نے خود چھیڑا ہے۔

مسٹر چکبست جناب امانت مرحوم کی زباں دانی پر حرف رکھتے ہیں خدا کی شان ہے کہ امانت مرحوم تو زبان سے ناواقف ٹھیرائے جائیں اور نسیم اہل زبان کہے جائیں اور پھر توقع کیجائے کہ نسیم کی ستائش میں آپ کی ہاں میں ہاں ملانے کو اہل لکھنؤ زبان کھولیں۔

سچ تو یہ ہے کہ کسی فن کی تنقید کے لئے اس سے واقفیت بھی ضروری ہے اگر کوئی شخص کہے کہ تاج محل میں یہ نقص رہ گیا تو اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ فن انجینئری سے واقف ہو۔ مسٹر چکبست کی تعلیم انگریزی بیشک قاعدے سے مکمل ہے مگر ان کو شاعری کے نکات اور اس کے فن سے کیا تعلق، اگر کچھ بھی واقفیت ہوتی تو امانت مرحوم کی زبان پر وہ اعتراض نہ کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ امانت مرحوم کو رعایتِ لفظی کا جنون تھا مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس وقت سوسائٹی کا رنگِ طبیعت کیا تھا اور یہ کہ رعایت لفظی اصنافِ سخن میں داخل ہے یا نہیں۔

جنون کی جگہ چکبست صاحب دوسرا لفظ بھی استعمال کر سکتے تھے مگر دلی خیالات پر وہ پردہ نہ ڈال سکے حالانکہ اس معاملے میں نسیم بھی امانت سے کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں۔

جناب ناسخ مرحوم پر ایک سخت چوٹ قومی تعصب کے پردے میں چکبست نے کی ہے جس کا کسی تذکرہ میں ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی اور ثبوت۔ چکبست اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"مشاعرہ شروع ہونے سے قبل شیخ ناسخ نے نسیم سے مخاطب ہو کر کہا: پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرع نہیں سوجھتا، انھوں نے جواب دیا فرمایئے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا ؎ شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا ...۔ ان کے منہ سے مصرع نکلتے ہی نسیم نے کہا ؎ تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

سب پھڑک اٹھے، شیخ ناسخ نے مذہبی چوٹ کی تھی مگر نسیم نے ٹھنڈا کر دیا۔"

اس کذب و افترا کے بیان میں چند باتیں قابل غور ہیں:۔

(۱) ناسخ کی غیور طبیعت اور شاعری کے دعوے ایسے نہ تھے جو وہ نسیم کو قابل خطاب سمجھتے اور ان کو اس تعظیم و تکریم کے ساتھ مخاطب کرتے جو آتش کو بھی کبھی خیال میں نہ لاتے تھے۔

(۲) ناسخ ایسے غیر مہذب نہ تھے کہ وہ ایک ہندو کو (اور پھر اپنے محبوب ہندو کو) مخاطب کرکے ایسا دلشکن مصرع پڑھتے۔

(۳) نسیم چاہے لاکھ حاضر جواب سہی مگر ناسخ کا دبدبہ اور طنطنہ ایسا تھا کہ وہ ان کو ناسخ کے سامنے زبان نہ کھولنے دیتا۔

(۴) در اصل نسیم نے کوئی مصرع لگایا، نہ ناسخ نے کوئی مصرع پڑھا، نہ اس حکایت کا ذکر کسی اور مقام پر دیکھا گیا۔ یہ صرف غلط قومی جوش کا نتیجہ ہے جس نے بے سر و پا قصے گڑھنے کی چکبست کو جرأت دلوائی ہے اور اس طرح ناسخ کا (بزعم خود) مقابلہ چکبست نے نسیم سے کیا ہے۔ نسیم کی طرفداری کرنے والوں کی نظر اس مقدمہ پر نہیں پڑی صرف چکبست کے فقروں میں آگئے۔ نسیم۔ نسیم۔ نسیم کہنے لگے۔

(۷)

اخبار "ہندو" نے ایک بار لکھا کہ:۔ "آج یہ وقت آگیا ہے کہ ہر شخص ہندو کو گائے ہی کی گالی دیتا ہے چنانچہ منشی امیر احمد صاحب مشہور شاعر اپنے قصیدے میں بہ مدحِ نواب رامپور لکھتے ہیں:۔

عہد وہ ہے جو ہو مسلم میہمانِ برہمن،
ذبح دعوت میں کرے خود گاؤ لاکر سامری

ریاض نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ:۔ "ہم اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آج "گاؤ" اور "سامری" لکھنا ہندوؤں کو چڑھانا ہوا تو کل "بت" اور بت کو "کافر" لکھنا اس سے بڑھکر اثر پیدا کرے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ منشی امیر احمد صاحب (خدانخواستہ) اب مسلمانوں کی طرف سے بھی گئے گزرے ہوا چاہتے ہیں کیونکہ وہ فرماتے ہیں

دکھلادے اے بت آج تو بہرِ خدا وہ شان
شیخِ حرم پکارے کہ میں برہمن ہوا

پھر ایسے اشعار سے نہ ایک منشی امیر احمد صاحب بلکہ ہر شاعر اور شاعر کیا بلکہ (اردو) شاعری "گائے" کی بحث اور مذہبی تعصب میں سب کے ہاتھ سے جایا چاہتی ہے۔

ہم چاہتے ہیں ہمارا دوست شاعری کو بحالِ خود رہنے دے تو بہتر ہے اور ہمارے دوست پر شاعری کا حق بھی ہے کیونکہ وہ بھی شاعری کا نام لیوا ہے اور غالباً اچھا شاعر ہے۔

سید عقیل احمد جعفری

دی مغل لائن لمیٹیڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن۔پورٹ۔سوڈان۔جدہ اور سویز تک مسافر مال واسباب لیجاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سرویسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔ ٹرنر مارلیسن۔اینڈ کمپنی لمیٹیڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

بکھرے ہوئے موتی

قیام گورکھپور کے زمانہ میں ریاض الاخبار اور فتنہ کی ادارت کے ساتھ ساتھ حضرت ریاض کا ایک اور بھی ادبی شغل جاری تھا وہ یہ کہ اپنے ایک انگریزی داں دوست سے روز شام کو ایک انگریزی ناول سنتے تھے اور پھر اس کو اپنی زبان میں اُردو کا جامہ پہناتے تھے اس طرح انھوں نے رینالڈس کے تین ناولوں کا ترجمہ تصویر، حرم سرا اور نظارہ کے نام سے کیا۔ حرم سرا چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ نظارہ بھی چھپا لیکن شایع نہ ہوسکا، تصویر صرف ریاض الاخبار تک محدود رہا۔

حرم سرا اور نظارہ کے بعض جملے اور فقرے، ہم پیش کرتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ریاض کی نثر نگاری میں بھی کتنی ادبیت پائی جاتی تھی

حرم سرا سے

اس کمرے میں تمام ایشیائی تکلف کی چیزیں موجود تھیں یہاں تک کہ غفلت کے پردے بھی پڑے ہوئے تھے۔

پلکوں سے معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے آنکھوں کے لئے یہ پردے بنائے ہیں تاکہ جب دستِ نگہ کسی کا نقد دل لائے تو یہ چھپا لیں

لبِ رنگیں اتنے نازک کہ راز کی بات بھی نہ چھپا سکیں۔

زلیخا، حسنِ خداداد کی وہ زندہ تصویر تھی کہ عکس بھی آئینے میں اس کی پوری خوبیاں نہیں دکھا سکتا تھا

تازہ اُلفت نے مئے کہن کے دور کا لطف پیدا کر دیا تھا

وہ بے تکلف بوتلیں لنڈھانا اور کاگ سے توبہ کا شکار کھیلنا

اس کے آنسوؤں میں گو خون کی سرخی نہ تھی مگر گلگوں رخسار پر جاتے جاتے وہ گلابی ضرور ہو جاتے اور جب رخسارِ رنگیں سے ڈھلکر دامن پر آتے تو یہ ضرور گمان ہوتا کہ اس کے پھول سے گالوں میں جو کچھ سرخی ہے وہ اشکِ خونیں کی ہے گویا آنسوؤں کو بھی پاس تھا کہ اس کے دامن پر دھبہ نہ آئے۔

اتنے گھنے بال کہ دل سے پہلے نظر کو اُلجھالیں

محبت کی ہر نگاہ تعلق کو اور بڑھا دیتی ہے

میں جن انگاروں پر لوٹ رہا ہوں اس کو "خلیل" ہی میرے لئے پھول بنا سکتا ہے.

تُرک اور یونانی کبھی نہیں ملتے مگر میدانِ جنگ میں

اس وسیع اور لہلہاتے ہوئے سبزہ زار میں خود رو لالۂ گل نے بہار کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا کسی طرف گھنی جھاڑیاں نظر کو اُلجھاتی تھیں کسی طرف شجرِ گل شاخ در شاخ ہو رہے تھے۔ حنا کی پیوستہ شاخوں کا کہیں کہیں دور تک سلسلہ تھا۔ قدرت نے منہدی کی ٹٹیوں کی آڑ میں منہدی لگانے والوں کے شکار کا عمدہ موقع پیدا کر دیا تھا۔ شبنم نے جو موتی عروسِ بہار پر شب کو نچھاور کئے تھے صبح ہوتے ہی سورج کی کرنوں نے اپنے نازک ہاتھوں سے ایک ایک کرکے چن لئے تھے۔ نسیم نور کے تڑکے ہی اپنی خدمت پوری کر چکی تھی اس کی موجوں نے اپنے لچکتے ہوئے ہاتھوں سے خار و خس کو ہوا پر بلند اُڑا کر مرغانِ نواسنج کے نشیمنوں میں ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ہوا، رنگ لالہ و گل کی آگ میں جلنے والوں کے کلیجے ٹھنڈے کر رہی تھی۔ پھول ہنس مکھ حسینوں کی طرح کھلے جاتے تھے۔

میووں کے اشجار، جوانی میں بھرے ہوئے معشوقوں کے رنگ کی طرح ٹپکے پڑتے تھے

لب ساغر گلوئے مینا کے بوسے لیتے ہیں

ایک خوشنما شام جس کی شفق نے دریا کے حبابوں کو گلاب کا پھول بنا دیا تھا

حُسن و عشق کی دو جاندار تصویریں اپنے اپنے رخ پر جدائی کا نقاب ڈالنے والی تھیں

ہوا کی موجوں نے اس کا دامن اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔ شام کی تاریکی نے اس کی تھکی ہوئی نگاہوں کو کسی قدر آرام دیا

پھولوں سے لدی ہوئی شاخوں اور ٹپکے ہوئے پھلوں کے درختوں نے تمازتِ آفتاب سے اپنے سایہ میں آرام دینے کا ہر ایک سے وعدہ کر لیا تھا۔

ہر امر میں مردوں نے بڑھکر حصہ لیا ہے مگر محبّت کا میدان عورتوں کی فتوحات کے لئے خالی کر رکھا ہے

تیرے سُنہرے بالوں کی چمک ذرے ذرے پر سونے کا پانی چڑھانے والی ہے

اس کی قدِ آدم تصویر حیرت کے آئینے میں جڑی ہوئی تھی۔ ہر نیا واقعہ اس کے نخلِ محبت میں تازہ قلم لگاتا تھا۔

اس کی پیشانی صبح کے اس دھیمی روشنی کے آفتاب کا دھوکا دیتی جو افق سے ابھر کر نصف نمایاں ہوا ہو

باسفورس کا پانی شور نہیں کرتا ہے سمندر کی چمکتی ہوئی سطح بتا رہی ہے کہ گہرائی میں ایک موتی چھپا ہوا ہے۔ ہزاروں اس کے نکالنے کو غوطہ لگاتے ہیں مگر جب وہ ملجاتا ہے تو کوئی واپس آکر یہ نہیں بتلاتا کہ کہاں پایا ہے۔ موت یا فنا جس نام سے یہ موتی مشہور ہے موجوں نے اُٹھا اُٹھا کر اور بھی اسے نیچے دبا دیا ہے۔ دفعتاً پھولوں کی سیج چھوڑ کر گہرائی میں کود پڑنا کچھ دیر سمندر کے تھپیڑوں کی تکلیف سہنا ایک چیخ ایک ڈبکی یہ سامان اس موتی کے ہاتھ آنے کے ہیں

آنسوؤں کے تار اس کے گلرنگ چہرہ کو اپنی نقاب میں لئے ہوئے ہیں

"وٹل اوٹ پہاڑ" میں نے انھیں بڑی اور سیاہ آنکھوں میں دیکھا جنکی دونوں پتلیوں میں خوشنما وصال کی راتیں چھپی ہوئی تھیں۔

کس قدر قابل رحم وہ دل ہے جس میں چبھتی ہوئی نگاہوں نے کھٹک پیدا کر دی ہو اور چبھی ہوئی پھانس کا نکالنا قابو سے باہر ہو۔

ہلالی نشانوں کی تابانی و درخشانی کہہ رہی تھی کہ یہ طلائی ورق آفتاب کے ترشے ہوئے ٹکڑے ہیں جنھوں نے وسیع زمین کے ذرہ ذرہ پر اپنا قبضہ کر لیا ہے

جو رنج بہت دن سے سو رہا تھا جاگا وہ آنسو جو آنکھوں کے اندرونی حصہ سے رخصت ہونے والے کو جھانک رہے تھے باہر نکل آئے۔

دل پژمردہ ہو کر بھی اتنا ضعیف نہیں ہوتا جس سے آہ نہ نکل سکے

وہ نہایت گراں بہا لباس زیب تن کئے تھا جس پر قیمتی جواہرات ایسے معلوم ہوتے تھے گویا اس پر اولے پڑے ہیں جو ابھی پگھلے نہیں ہیں

گھوڑا اپنے سوار کی مرضی سمجھ گیا اور اس طرح سمٹ کر تیزی سے اُڑا کہ سخت جنگلی کا تیر بھی اس کی ہوا نہ پاتا۔

جب تک امید مجھ کو جھلک دکھاتی رہی میں بےچین اور مضطرب رہا مگر جب میں نے دیکھ لیا کہ کوئی انسانی طاقت مجھ کو بچا نہیں سکتی تو استقلال میرے چہرے پر مایوسی کی نرمی کے ساتھ ظاہر ہوا

امید کی چمکتی ہوئی شعاعیں میرے دل کو اپنے جھرمٹ میں لیکر اس طرح نگہبانی کرتی ہیں جیسے فرشتے سوئے ہوئے معصوم بچہ کی حفاظت

کرتے ہیں۔

نیک آدمی اپنا دل اپنی زبان پر رکھتا ہے مگر ہوشیار آدمی اپنی زبان اپنے دل پر

افسوس خدائی پر طاقت دی مگر خود میرے دل پر مجھے طاقت نہ دی

محبت اس بیل کی طرح ہے جو جنگلی خودرو اشجار سے لپٹ کر اسوقت تک سرسبز رہتی ہے جب تک اس کی کونپلوں کو اوس ملتی رہتی ہے لیکن جب زبان خشک کرنے والی مایوسی کی گرمی اپنی آگ بھری ہوئی سانس سے جھلسانے والی ہوا کو روانی دیتی ہے تو وہ رفتہ رفتہ اس درخت کو چھوڑ دیتی ہے جس نے ایک مدت تک اس کو لپٹائے رکھا تھا

کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا جس نے کیسۂ زر ایک بڑے قالین کے وسط میں رکھکر یہ شرط کی کہ جو کوئی اس کیسۂ زر کے قالین پر پاؤں رکھے بغیر اُٹھائے وہی اس کا مالک ہے۔ حاضرین نے غلط کوششیں کیں اور ان کا نتیجہ غلط ظاہر ہوا پھر ایک فرزانہ شخص مسکرا کر اُٹھا اور اس نے ایک طرف سے وہ قالین لپیٹ کر کیسۂ زر اُٹھا لیا

نظارہ سے

ہم جب ایک دوسرے کو دیکھتے تو خوشی ہم دونوں کی آنکھیں چوم لیتی۔ اس کا نکلتا ہوا ڈیل اب جوانی سے گلے مل رہا تھا حُسن و جمال پیار سے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ اس کی خوبصورتی میں ایک قسم کی نرماہٹ تھی

جسوقت میں نے جولیٹ کو اسٹیج پر مہین کپڑے پہنے دیکھا تو میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی نگاہوں کے تار سے اگر کوئی لباس طیار ہو سکتا تو ان کپڑوں کو دیکھتے اس میں پھر بھی حجاب ہوتا ایک تو مہین لباس پھر اس کے گلرنگ بدن میں اتنا چبھا ہوا کہ رنگت اوپر سے پھوٹ نکلتی۔

تیرے کافر حُسن کا یہ ادنیٰ اثر ہے کہ دل بیقراری سے گردش کرنے والی آنکھ کی پتلی بنجاتا ہے اور آنکھ کی پتلی ایک ٹھہرا ہوا دل۔ یہ جی چاہتا ہے کہ ٹکٹکی باندھے تجھے دیکھا کرے

ہر جوان عورت یہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ خوبصورت ہے

تیرا سر کس خوبصورتی کے ساتھ تیرے دوشِ ناز پر رکھا ہوا ہے مثل اس پھول کے جو کسی نازک شاخ پر ہو

تیرے شانوں کا ڈھلاؤ تیرے سینے کا اُبھار تیری لمبائی کے تناسب سے ہے

دماغ کی روشنی کا عکس ڈالنے میں بڑی اور نیلی آنکھیں ایمان سے کام لیتی ہیں۔ بعض وقت اس کا چہرہ خوشی سے اس طرح دمکنے لگتا جس طرح سورج کی شعاع پڑنے سے خوبصورت پتھر کے چھپے ہوئے حصے چمکنے لگتے ہیں

میری دعائیں دُنیا سے نرالی ہیں میری ہر بات اُلٹی ہے۔ جب میں غمگین ہوتا ہوں تو بہشت کے نظاروں سے دل خوش کرتا ہوں اور جب میں خوش ہوتا ہوں تو حقیقت میں بہت ہی رنجیدہ ہوتا ہوں

جب میرا خیال کسی کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے تو میں اس سے اتنا ہی دور ہوتا ہوں جتنا دنیا کے دونوں سرے

میرا دل جب کسی کی محبت سے گرم ہوتا ہے تو ظاہر میں بہت سرد معلوم ہوتا ہے اوپر سے تو جمی ہوئی برف کی شکل ہوتی ہے اور اندر ہی اندر جان پگھلتی ہوتی ہے

اس کے ہلکے رنگ کے عنبریں بال بہت ہی چمکیلے اور گھنے ہوئے تھے۔ بل کھائی ہوئی لٹیں اس کی خوبصورت سفید گردن پر پڑی ہوئی تھیں۔ عیب دیکھنے والی نظر زیادہ سے زیادہ کچھ بتا سکتی تو یہی کہ اس کا رنگ زیادہ سپید ہے لیکن کیا یہ سفیدی پھیکی تھی نہیں نہیں اتنی خوشنما کہ دیکھنے والے کے چہرے پر خوشی کا رنگ آجائے۔ پتلی جلد پر اتنی چمک اور تیزی کہ تندرستی سرخی کا کام دیتی

اس کی خوبصورتی اسی کے حسن کی آگ تھی

افلاس بھوت کی شکل میں ہر طرف سے حملہ کرتا ہے داہنی طرف سے بچو تو بائیں طرف سے لپٹنے کو بڑھتا ہے۔ جب افلاس کسی کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے جب برف کی طرح اس کی سرد ہوا کلیجے کے پار ہونے لگتی ہے جب وہ اولے کی طرح بدن پر ہاتھ رکھ کر مفلس کی ہڈیوں کے گودے تک کو ٹھٹھرا دیتا ہے تو اسوقت گناہ اور جرم اپنے سنہرے اور چمکتے ہوئے رنگ میں گرمیاں دکھاتے ہیں

میں نے عصمت کے اس سنہرے دھاگے کو جس سے میں نیکی کے مندر کے ستون سے بندھی ہوئی تھی توڑ ڈالا

ہزاروں چبھتی ہوئی نگاہیں باریک نوک کی سوئیاں چبھوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ لغزش اس محبت کے ساتھ میرے پاؤں سے لپٹی تھی کہ مجھے قدم اُٹھانا مشکل تھا

میری بچھڑی ہوئی قدرتی شرم اور جھجک اپنی باہیں میرے گلے میں ضرور ڈال دیتی اگر کامیابی کا جوش اور غرور پانے کی خوشی جھجک سے میرا دامن چھڑا کر مجھ کو شرم کی گھبراہٹ سے الگ نہ کر دیتا

اپنی کامیابی پر مجھے وہ خوشی تھی جو شراب پینے والے کو اس کے سرور سے ہوتی ہے

وہ سو رہی تھی لمبی پلکیں جو اس کی آنکھوں کا جھالردار پردہ تھیں اپنا سایہ اس کے گالوں پر ڈالے ہوئے تھیں۔ اس کی میٹھی نیند اور سانس سے اُبھرتے دبتے سینے کو دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ اس میں ایسا دل ہے جو میرے کاموں کی طرف متوجہ ہو

اُس کا چہرہ گول تھا آنکھیں بڑی اور سیاہ جن میں آگ بھری ہوئی تھی ان آنکھوں کو رحم کے آنسوؤں سے ڈبڈبانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا

چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور کمر جھک گئی تھی مگر اس کی آنکھوں کی تیزی اور چمک یہ کہتی تھی کہ جوانی کی آگ کی بھڑک ابھی تک باقی ہے۔

چہرے پر ایسی تازگی تھی جو جوانی کی مٹی ہوئی باتیں گزرے ہوئے انداز اور خوبصورتی کے نشانوں کو لئے ہوئے تھی

ہونٹوں کی سرخی اور بھرا پن کچھ کچھ اسوقت نظر آجاتا تھا جب سانس لینے سے نقاب کی جھالر ادھر اُدھر ہوتی تھی

وہ خط ایسا پاکیزہ اور نستعلیق تھا کہ خود بخود مجھے لکھنے والے کی خوبصورتی کا خیال بندھ گیا

سانس سے پہلے آواز آنے لگی پھر خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا یہ دیکھ کر چند منٹ تک مجھ پر عجب عالم طاری رہا پھر معلوم ہوا کہ میں موت کو اپنے ہوش میں دیکھ رہی ہوں

انتہا کا رنج جب اپنے ہی بوجھ سے بے قابو ہو جاتا ہے تو تکان سے آرام کا خواہشمند ہوتا ہے

لڑکی کی شادی کی خوشی میں بہت کچھ اداسی ملی ہوئی تھی

خوشی کے پھول اس کی آرزوؤں کے سنہرے تاریں گندھتے ہوئے اس کے سر کا سہرا بنے جاتے تھے

جو بات اس میں پائی جاتی تھی وہ خوبصورتی نہ تھی کیونکہ خوبصورتی کے لفظ پر خیال کرتے ہی آنکھوں میں کسی کی بھولی بھولی (پیاری) صورت گھر کر لیتی ہے وہ بھولی صورت جس کی ہر ادا دل لبھانے والی ہو جس کا ہر انداز دیوانہ بنانے والا ہو پھر خاص کر جب جوانی نے اپنی آمد کی خوشی سنا کر ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر دی ہو اور حسین چہرے کے آگ لگانے والے رنگ کو آب دیدی ہو۔

حرم سرا سے کچھ اور انتخاب

سیاہ پتلی نے بالوں کی جھلک کو دبا رکھا تھا۔ آئینۂ رخسار زنگ سے صاف۔ صرف سیاہ مونچھیں دو کوں سروں پر بل کھائے اوپر کے نازک اور رنگین ہونٹ پر سایہ کئے ہوئے

قسطنطنیہ دو سمندروں اور دو برِّ اعظموں کے اتصال پر اس طرح واقع ہوا ہے گویا الماس دو نیلموں اور دو زمرّدوں کے بیچ میں جڑ دیا گیا ہے

آپ زندگی سے محبت کرتے ہیں اور میں نفرت، میں لبِ گور تک ممکن ہو تو اپنے ہی پاؤں سے جاؤں

میرا سینہ تیرے لئے ایک محفوظ سپر ہے، میری گردن کی رگیں دشمن کے کامیاب ہاتھ اُلجھانے کو کمند کے لچھے سے کم نہیں ہیں

بلند درختوں کی چوٹیوں پر آفتاب کی کرنیں چھائی ہوئی تھیں اور وہ گویا جانے کا نام نہ لیتی تھیں جاتے جاتے بھی وہ اپنی کچھ دھیمی تابانی شفقِ شام میں چھوڑ گئیں

ہر طاؤس بجالِ خود مہ جبینوں کے دامن پر دل پر داغ کی کیفیت رکھتا ہے اور دلِ داغدار بھی وہ جس کی بیتابیاں کسی کی نظر کو رقصِ طاؤس سے زیادہ محو کرلیں

بہار کا موسم اپنی جانفزا ہواؤں اور خوشنما پھولوں کے ساتھ آیا موجِ رنگ نے چمن زاروں سے صحرا تک آنے جانے میں دیوانوں کی رفتار پیدا کی بوئے گل سے جنگل بس گئے مرغانِ نواسنج کے نغمے دور دور پہونچے۔

سید عقیل احمد جعفری

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دُنیا:۔ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرئیوڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

الہامات شاد:۔ شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن ان کے کلام کا انتخاب معہ ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

اقبال کی شاعری:۔ یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنے علاوہ محصول

مقام محمود:۔ مولانا عبدالمالک کے ادبی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ۔ علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

انتخاب کلام ریاض

"ریاض رضواں" کے نام سے ریاض مرحوم کا کلیات شایع ہو چکا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قاضی تلمذ حسین صاحب ام۔ اے نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن شاید اس سے بہتر خدمت یہ ہوتی کہ کلام ریاض کا انتخاب کر کے بجائے ۷۴۴ صفحات کے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی سو صفحات کا دیوان شایع کیا جاتا۔ اس طرح حجم کم ہونے کی وجہ سے کتاب کی قیمت کم ہو جاتی اور اس کی اشاعت کافی ہو سکتی۔

اس کلیات کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ غزلیات کا ہے جو ۴۰۰ صفحات کو محیط ہے اور دوسرا حصہ جس میں علاوہ غزل کے اور سب کچھ ہے۔ ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرا حصہ بالکل حذف کر دینا چاہئے تھا اور غزلیات کے حصے کو بھی انتخاب کر کے نصف رکھنا چاہئے تھا۔ ہر چند ریاض مرحوم کی خواہش یہی تھی کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے بلا امتیاز رطب و یابس جوں کا توں سب شایع ہو، لیکن یہ کوئی ایسی شرعی وصیت نہ تھی جس پر عمل کرنے سے ان کے احباب یا اعزہ کو عاقبت کی خرابی کا اندیشہ ہوتا۔

اول تو ریاض رضواں کی اشاعت اتنی دیر میں ہوئی کہ دُنیا کا ذوق تغزل کچھ سے کچھ ہو گیا اور دوسرے اس کی "بلا انتخاب" اشاعت نے اس کے حجم کو اتنا بڑھا دیا کہ جو لوگ کلام ریاض کے شایق تھے وہ بھی اپنا شوق پورا نہ کر سکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی وقت باقی ہے کہ کلام ریاض کا ایک مجموعہ منتخب اشعار کا شایع کیا جائے، اور میں شاید یہ جرأت کرتا لیکن افسوس ہے کہ موجودہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے اور میں صرف اُن اشعار کو پیش کرتا ہوں جو "انتخاب لا انتخاب" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہ سکتا کہ ان کے تمام بہترین اشعار اتنے ہی ہیں، لیکن یہ ضرور کہ سکتا ہوں کہ اس انتخاب میں ان کا کوئی شعر ایسا نہیں ہے جو "نگاہِ انتخاب" سے بچ سکے۔

نیاز

کچھ شوخی رفتار میں بھی کم ہے قیامت — کچھ قد بھی نکلتا ہے بُتِ شوخ ادا کا

لاکھ پردوں میں کوئی اے نگہِ شوق رہے — دیکھ لیگا جو کوئی دیکھنے والا ہوگا،

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض — زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا،

ذرا جو ہم نے انھیں آج مہرباں دیکھا — نہ ہم سے پوچھئے کیا رنگِ آسماں دیکھا

بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم — لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

وہ دل مرا ہو کہ دل کی ہو آہ کوئی ہو — بجھی سی آگ کا اُٹھتے ہوئے دھواں دیکھا

ہنگام نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

جب حال دل کہا تو یہ سننا پڑا ہمیں،
تم تو سنا رہے ہو فسانہ سنا ہوا،

جگمگھٹ وہ گلرخوں کے الٰہی کہاں گئے
کیا ہو گیا گلاب کا تختہ کھلا ہوا

میخانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

کوئی مست میکدہ آگیا مئے بیخودی وہ پلا گیا
نہ صدائے نغمۂ دیر اُٹھی نہ حرم سے شورِ اذاں اُٹھا

رہ گیا پردہ ترے چاک گریبانوں کا
حشر میں کوئی بھی پرساں نہیں دیوانوں کا

آنکھ سے دیکھ لیا خونِ تمنا سو بار
دیکھئے پھر بھی ٹپکتا ہے نظر سے کیا کیا،

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا،

کچھ بھی ہو ریاض آنکھ میں آتے نہیں آنسو
مجھ کو تو کسی بات کا اب غم نہیں ہوتا

اک ذوقِ نالہ ضبط سے وہ بھی مٹا ہوا
میں کیا بتاؤں کیا دلِ اندوہگیں میں تھا

مزا دیتی ہیں گھڑیاں انتظارِ یار کی کیا کیا
کبھی مسرور ہو جانا کبھی رنجور ہو جانا

اب خدا جانے بہار آتی ہے اس میں کہ نہیں
میرے دم سے کبھی آباد تھا گلشن اپنا

باغباں کام ہمیں کیا ہے وہ اُجڑے کہ رہے
جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

آفتاب حشر کب چمکا ریاض،
داغِ مے دامن سے جب میں دھو چکا

بہار آئی تھی گلشن میں وہ دن بھی یاد ہیں ہم کو
کسی کے ہاتھ میں ساغر تھا کوئی گل بدامن تھا

قریب نجد کا جنگل نہ بیستوں نزدیک
یہ کون تھا مجھے صحرا میں جو پکار گیا

بتوں کو دیکھ کے اللہ یاد آتا ہے
وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ پیار گیا

اُڑانے پھول حسیں آئے ہیں بہار میں کیا
لگی ہے آگ سی یہ آج لالہ زار میں کیا

مرے ہاتھ سے پہننا انھیں اور بار ہوتا
مگر اور بھی مچلتی جو گلے میں ہار ہوتا،

نالہ ہمیں کرنا تھا، دم عشق کا بھرنا تھا
سو رنگ سے مرنا تھا، ہر رنگ سے مر دیکھا

ایک چلو کے نہیں کوثر و تسنیم ریاض
خاک اُڑتی جو لبِ خشک مرا تر ہوتا،

عالمِ ہو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا،

ہم تھک کے گرے، گر کے اُٹھے، اُٹھ کے چلے بھی
تجھ پر اثر اے دوریِ منزل نہیں ہوتا

کوئی جا کر ریاض کو سمجھائے
کچھ خفا ہیں وہ اپنی جان سے آج

مرنے کا ریاض اپنے ذرا نام نہ لینا
جینا ابھی مر مر کے تجھے ہے مری جاں اور

ملایا خاک ہو کر حسرتوں کو اپنی مٹی میں
چھپایا کارواں کو ہم نے گردِ کارواں ہو کر

دن میں چرچے خلد کے شب میں مئے کوثر کے خواب
ہم حرم میں آرہے میخانے ویراں دیکھ کر

بڑھی اس دل کی بیتابی یہاں تک
ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

نہیں چھپتا ترے عتاب کا رنگ
کہ بدلنے لگا نقاب کا رنگ

رنگ کا اس کے پوچھنا کیا ہے
جس کا سایہ بھی دے گلاب کا رنگ

پایا جو تجھے جو کھو گئے ہم،،
بیدار ہوئے تو سو گئے ہم

اب دشت نوردِ عشق جو ہو،
اس راہ میں کانٹے بو گئے ہم

اس حج میں وہ بُت بھی ساتھ ہوگا
یہ سچ ہے ریاض تو گئے ہم

نشہ سا ہے شراب کا ہر چند پی نہیں
یہ رنگ ہے شباب کا تو زندگی نہیں،

کوئی ناخوش ریاض سے کیوں ہو
اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

پھوٹ کر رونا نہیں تو پھوٹ ہی جائیں ریاض
کام کے جب دیدۂ پُرنم نہیں تو کچھ نہیں

کرن سورج کی نکلی جام مے سے،
یہ کیسی دھوپ پھیلی چاندنی میں،

وہی ہم ہیں نہ چھوڑا تار تک ہم نے گریباں کا
وہی ہم ہیں کہ اب ٹکڑے لئے دامن کے بیٹھے ہیں

ہمنشیں نالے مرے جا کے فلک پر چکرائے
کچھ تو گم ہو گئے، کچھ رہ گئے سیاروں میں

رنگ دل کا داغ کب لاتا نہیں
اس چمن کا پھول مرجھاتا نہیں،

چلتے پھرتے رہتے ہیں نقشِ قدم
تو کہیں آتا نہیں، جاتا نہیں،

سیر کو جلوہ گاہ طور کہاں
دیر ہے پاس جائیں دور کہاں

حشر اُٹھانے میں ساتھ دے میرا
گم ہوئی ہے صدائے صور کہاں

کوئی بھی اہل جنوں کی یہاں نہیں سنتا
چمن کے نغمہ سرا اپنی گائے جاتے ہیں

داورِ حشر سے کیا شکوۂ بیداد کریں
ہاں سنیں آپ تو کچھ آپ سے فریاد کریں

مدت ہوئی رسائی قسمت کو رو چکے
وہ سنگ در کہاں، یہ ہماری جبیں کہاں

ساغر پر آنکھ پڑ رہی ہے بزم غیر میں
کھل کھیلنے کو ہے نگہ شرمگیں کہاں،

ٹوٹی ہے آکے کوچۂ جاناں میں آج یاس
اب دیکھیں ٹوٹتا ہے دم واپسیں کہاں

جام ہے دست یار میں، یار ہے لالہ زار میں
پھول اُڑے بہار میں، پھول کھلے بہار میں

کس قدر گور غریباں کے ہیں افسردہ چراغ
جس قدر تیز کرو اور بجھے جاتے ہیں

نوخاستہ سبزہ کو ہوئی جاتی ہے لغزش
مستی تری ہم بادِ صبا دیکھ رہے ہیں

دیکھا نہیں ہم نے ابھی دُنیا کا بدلنا
بدلی ہوئی دُنیا کی ہوا دیکھ رہے ہیں

شررِ طور ہے جو موج ہے پیمانے میں
بجلیاں کوندتی ہیں آج تو میخانے میں

الگ ہے خدائی سے کچھ ساخت ان کی
یہ بت اور سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں

دل تو ہے کیونکر کہوں پہلو میں میرے دل نہیں
ہے وہی محفل مگر اب گرمی محفل نہیں

وصل کی شب تو نہیں یارب کہیں،
صبح کی کچھ کچھ جھلک ہے شام کی

جاؤں کیا گرمیِ گفتار سے جی ڈرتا ہے — طور کو پھونک نہ دے شعلۂ آواز کہیں

عشق ہے وہ، نام جس کا رکھ لیا ہو سب نے درد — درد ہو تو چارہ گر کچھ درد کا درماں کریں

بجلیاں مجھ کو گرانا ہیں سرِ بزم ریاض — قصۂ طور، ذرا آپ میں آلوں تو کہوں

اپنی رسوائیوں کا حال سُناؤں کیونکر — ان کے کوچہ کی زمیں سر پہ اُٹھالوں تو کہوں

باغباں دل میں بھری ہیں تری باتیں کیا کیا — آشیاں جا کے کہیں اور بنالوں تو کہوں

وصل میں پوچھنے بیٹھے ہو تم افسانۂ ہجر — میں ذرا تم کو گلے اپنے لگالوں تو کہوں

آتشِ شوق بھڑک اُٹھتی ہے موقع پاکر — ہجر کی بات، لگی دل کی بجھالوں تو کہوں

شب کا افسانہ مرے منھ سے سنیں گے یہ حسیں — منھ چھپالوں تو کہوں، آنکھ جھکالوں تو کہوں

کہیں تیز ہے کہیں نرم ہے یہی آہنگ مطرب خوشنوا — مرے نالہ میں ترے نغمہ میں، مرے سوز میں ترے ساز میں

کل تو روتے تھے اپنے دامن کو — اے جنوں آج آستیں بھی نہیں

آپ جب تک تھے جان تھی اس میں — جائیے اب دلِ حزیں بھی نہیں

فسردہ دل ہوں مجھے کیا ہے کوئی موسم ہو — بھری بہار میں کیا تھا جواب خزاں میں نہیں

ہمیں تو لطف آتا ہے وہ جھوٹے ہوں کہ سچے ہوں — عجب لذت ہے ان کافروں کے عہد و پیماں میں

مجھ کو دیکھا تو ہنس کے کہتے ہیں، — اشک اب بے سبب بھی بہتے ہیں،

صدقے اپنے درازیِ قد کے — وہ مجھے بیوقوف کہتے ہیں،

وہ ستاتا ہے ستاتے جو نہیں تم مجھ کو — دھوکے دیتا ہے بری طرح تو ہم مجھ کو

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی اور کعبہ میں — بھلے کو ہم دبالائے تھے ناقوسِ برہمن کو

جگہ آنکھوں میں دینے کو کھلے سو غنچۂ نرگس — قفس سے آتے آتے مل گئے سو آشیاں مجھ کو

سرِ دامن ترے کوچہ کا غبار آئے تو — پھول برسائے نہ برسائے، بہار آئے تو

سحر ہوتی ہے ٹھہرو، رات آخر، وقت آخر ہے — نہ جاؤ ختم ہوتی ہے، کہانی دیکھتے جاؤ

پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہیں — اور جو بیساختہ آجائے تبسم مجھ کو

جی اُٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے — ہائے پیدا ہوئے لو آج بھی مرنے والے

شبِ ماتم کی اُداسی ہے سہانی کتنی — چھاؤں میں تاروں کے نکلے ہیں سنورنے والے

اب کون کلیم بن کے آیا — پھر طور پر آگ سی لگی ہے

کیسا پینا، کہاں کی توبہ — اب میں ہوں، خدا ہے، بیخودی ہے

خوش ہو گئے ریاض سے بھی ملنا — کیا باغ و بہار آدمی ہے

توبہ لب پر وعظ سے بے اختیار آنے کو تھی — وہ تو کہئے بچ گئے، فصلِ بہار آنے کو تھی

ہو کر بے تاب جب نظر کی — رُخ سے ترے خود نقاب سرکی

کب مہ مقابل آئینہ تھا تم نے اپنی طرف نظر کی

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی،
نازک کلائیوں میں حنا بستہ مٹھیاں شاخوں میں جیسے منھ بندھی کلیاں گلاب کی

ایک افسانۂ حسرت تھا دمِ نزع ریاضؔ ان سے کہنا وہ مرا، شکر ہے حال اچھا ہے

چلے آتے ہیں مدہوش خوش کس کے گھر سے وہ ہنستے کھیلتے بادِ سحر سے

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
تمھیں کیونکر بتاؤں کیا مرے دل پر گزرتی ہے تمھیں کیونکر دکھاؤں تم میں کیا عالم نکلتا ہے

ہجر سے بڑھکر مصیبت کوئی آنے کی نہیں موت کو رکھ چھوڑئے کس زندگی کے واسطے

نہیں بنتی ہے مجھے پاؤں اُٹھاتے دھرتے، کششِ جادۂ منزل کبھی ایسی تو نہ تھی
دور رہکر بھی ریاضؔ آگ لگی رہتی ہے یار کی گرمیِ محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

طاقتِ فریاد اب ہم میں کہاں، بات کرتے ہیں کلیجہ تھام کے

اب تو وعدہ بھی وہ نہیں کرتے دن قریب آ گئے قیامت کے

ڈھونڈھ کر دل ترے کوچہ سے پریشان گئے چھاننا خاک کا تقدیر میں تھا چھان گئے

فلک تک لے گئی آہِ رسا دل کو یہ کہکر اب ان کا بام آتا ہے، اب ان کا بام آتا ہے،
بہت چمکی ہوئی اک جلوہ گہ ہے جلوہ گاہوں میں برابر طور کے ہم کو نظر اک بام آتا ہے

کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا ہم آئے تو پردے سے باہر نہ نکلے

آگے قدم بڑھائیں تو منزل کو ہو گریز ہم پاؤں توڑے بیٹھے ہیں منزل کے سامنے
ہنگامہ خیز حشر کی اللہ ری دھوم دھام دیکھا تو کچھ نہ تھا تری محفل کے سامنے

پہونچیں کہ نہ پہونچیں یہ ہے تقدیر ہماری قسمت کی کجی جادۂ منزل میں نہیں ہے

مجھے یہ ڈر ہے نہ پھولے پھلے بہار میں یہ جھکی ہوئی ہے بہت شاخ آشیاں میری
تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری
کچھ اب کی باغ میں اس دھوم سے بہار آئے نہ باغباں کی سنوں میں نہ باغباں میری

میکدہ سے جو گیا میں تو سوئے دیر گیا اب کی جاؤں تو ملوں اہلِ حرم سے پہلے
کام لیتے وہ کرم سے تو ستم ہو جاتا خیر گزری کہ پڑا کام ستم سے پہلے

حُسن پر حُسن تبسم جانِ حُسن جب ہنسیں منھ چوم لینا چاہئے

یہ میکدہ کی بھیڑ یہ انبوہ یہ ہجوم، ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے
دل سے گئی نہ لذتِ عصیاں تمام عمر کیا کچھ کیا مگر نہ پھرا جی گناہ سے

دامن اُٹھائے صبح قیامت ہے ساتھ ساتھ آئے ہیں جلوہ گاہ سے وہ خوابگاہ میں

جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے
جیتے جی وہ جہاں سے اُٹھتا ہے

ایک جھونکے نے اُلٹ دی طرب انگیز بساط
اے ریاض آج سے دنیا کی ہوا اور ہوئی

عتاب یار کا اس کے سوا جواب نہ تھا
ہم آئے تو لئے آئینہ روبرو آئے

دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا
کلیم طور پر اُن سے جو گفتگو آئے

میں رکھ لوں ریزۂ مینا کو دل میں
ارے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے

دوکان مے ہے شکر اسکا پلا کر دس کو پیتے ہیں
فراغت سے گزرتی ہے عجب آسودہ حالی ہو

یاد پیری میں اِدھر آئی اُدھر بھول گئے
اے جوانی تری ہم شام و سحر بھول گئے

خضر یونہی گم رہیں گے عمر بھر
یونہی عمر جاودانی جائے گی

لئے خالی کوئی بوتل ریاض آئے ہیں زمزم پر
سنا حضرت سے ظاہر کچھ کرامت ہونے والی ہو

ہم نے منھ چوم لیا رُخ سے ہٹا کر آنچل
منھ چھپائے ہوئے نکلا تھا اِدھر سے کوئی

مسکی ہوئی محرم ہے کوئی آنکھ نہ ڈالے
آنچل سے چھپائے اسے آنچل سے چھپالے

اس طرح کہ گھونگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھالے

جب چلے سوئے لحد مڑ کے نہ دیکھا گھر کو
ایسے روٹھے کہ کسی سے بھی منائے نہ گئے

کوئی جانے یہی ہیں ایک جلوہ دیکھنے والے
یہ موسیٰ اچھے آئے جا کے تنہا دیکھنے والے

سنو افسانۂ جم، جام رکھ کر سامنے اُن کے
ابھی دو چار ہیں جم کا زمانہ دیکھنے والے

ریاض اک عمر گزری دیر میں آئے تو اب تک
حرم میں گونجتی پھرتی ہے راتوں کو اذاں میری

جانے والے نہ ہم اس کوچہ میں آنے والے
اچھے آئے ہمیں دیوانہ بنانے والے

ساتھ صحبت کے وہ سب حرف و حکایات گئے
سننے والے ہیں نہ افسانہ سنانے والے

داغ سوزاں سے مرے چند شرارے نکلے
چاند نکلا شب فرقت نہ ستارے نکلے

آ بیٹھے ہیں دل تھام کے ہم تیری گلی میں
ہم کیوں گلۂ گردش ایام کریں گے

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دُنیا بدل گئی

واقفِ راز کوئی ہم سے یہ کہتا تھا ریاض
جس کو اللہ بنائے وہی دیوانہ بنے

روشن کئے چراغ لحد لالہ زار نے
اس مرتبہ تو آگ لگادی بہار نے

حشر بھی تو ہو چکا رخ سے نہیں ہٹتی نقاب
حد بھی آخر کچھ ہے کب تک کوئی دیوانہ بنے

ہمیں خدا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا
نکل گئے ہیں بہت دور جستجو کرنے

خوب کعبہ سے دیر میں آئے
ہم ریاض آج خوش ہوئے تم سے

کچھ کچھ انھیں بھی آئی ہنسی روکنا پڑی
پینا پڑے ہمیں بھی کچھ آنسو کبھی کبھی

عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے — تم بھی ہو، ہم بھی ہیں، لیکن بات دل کی دل میں ہے

قفس میں ہم تھے گھرے بادلوں میں بجلی تھی — تڑپ تڑپ کے رہے دونوں آشیاں کے لئے

کتنے کعبے ملے رستہ میں کئی طور ملے — ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

صیاد گھر ترا مجھے جنّت سہی مگر — جنّت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے — کیوں بُرے بنتے ہو تم ناحق کسی کے واسطے

مرگیا ہوں، یہ تعلق ہے جو میخانے سے — میرے حصّہ کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی — مے پرستو یہ کوئی نام ہیں میخانوں کے

نشّے سے جُھکی پڑتی ہیں یونہی تری آنکھیں — چھیڑو دل سے مرے اور بڑھا بوجھ حیا کا

دلوائی یاد وعدۂ فردا کی روزِ حشر — مقصود دن سے وقت مگر رات ہی کا تھا

یاد آتی ہیں جنوں خیز ہوائیں ان کی — اب نہ وہ ہم ہیں نہ عالم وہ بیابانوں کا

کیجئے کیا اسے، ہے موت بھی ان کے بس کی — زہر ہم کھائیں گے تو بھی ہمیں جینا ہوگا

آہ بھی شوخ ہے کتنی کہ نہ آئی لب تک — ہم پشیماں ہوئے تکلیف اثر سے کیا کیا

اے جوانی، ترے دن رات ٹھہرتے ہی نہیں — جی اُلجھتا ہے مرا شام و سحر سے کیا کیا

مایوس اثر اشک عنادل نہیں ہوتے — مانوس اثر۔ گریۂ شبنم نہیں ہوتا

وہ بیخودانِ عشق کو ٹھکرائیں تو سہی — اچھی کہی کہ ہوش میں آیا نہ جائے گا

ڈرتے ہو چھوتے پائے حنائی سے قبر کو — بیٹھو بھی تم سے حشر اُٹھایا نہ جائے گا

چمکے گا اب نہ داغ دل داغدار کا — لو بجھ گیا چراغ شبِ انتظار کا

لطف دیتا ہے یہ ہر بار ترا کیا کہنا، — میں بھی کہہ لوں مرے دلدار ترا کیا کہنا

اثر اضطراب قیس نہ پوچھ — پردہ اُٹھ اُٹھ گیا ہے محمل کا

گھر میں دس ہوں تو یہ رونق نہیں ہوتی گھر میں — ایک دیوانہ سے آباد ہے صحرا کیسا

منہ کو آیا ہے کلیجہ سو بار — ہائے عالم شب تنہائی کا

گئے ہوئے مرے دل کا نشاں نہیں ملتا — لٹا ہوا کوئی اب کارواں نہیں ملتا

حشر میں ایک بھی تو داغ بداماں نہ رہا — کوئی عصیاں جو بچا مجھ سے وہ عصیاں نہ رہا

مُنہ چوم لوں یہ کس نے کہا مجھکو دیکھ کر — دیوانہ تھا ہی اور بھی دیوانہ ہوگیا

ضد آپ کو اثر سے اثر کو دُعا سے لاگ — فرمایئے تو ہاتھ اُٹھالیں دُعا سے ہم

تڑپنے والوں میں بھی تفرقہ ہے — قفس میں ہم ہیں بجلی آشیاں میں

نہ شبستاں ہے نہ اب شمع شبستاں کوئی — گھر کا یہ حال ہے جیسے ہو بیاباں کوئی

نگار

چندہ سالانہ صہ
اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد - ۴۳	فہرست مضامین جنوری و فروری سنہ ۱۹۴۳ء	شمار - ۱ - ۲

ریاض مرحوم کی یاد میں ---------- اڈیٹر ---------- ۱
اعتراافات ---------- اڈیٹر ---------- ۲
مختصر سوانح حیات ---------- سید عقیل احمد جعفری ---------- ۹
ریاض کی شاعری ---------- (پروفیسر) امرناتھ جھا - وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی -- ۱۳
ریاض کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات ---------- ریاض مرحوم ---------- ۲۲
ریاض کی شوخ نگاریاں ---------- مجنوں گورکھپوری ---------- ۳۶
ریاض کی شوخیاں ---------- سید عقیل احمد جعفری ---------- ۴۵
ریاض کی شگفتہ نگاری ---------- خواجہ احمد فاروقی ---------- ۴۸
مکاتیب ریاض ---------- سید عقیل احمد جعفری ---------- ۵۴
ریاض ---------- فراق گورکھپوری ---------- ۵۹
ریاض کے بعض انتقادی مباحث ---------- سید عقیل احمد جعفری ---------- ۶۸
بکھرے ہوئے موتی ---------- سید عقیل احمد جعفری ---------- ۷۶
انتخاب کلام ریاض ---------- اڈیٹر ---------- ۸۱